REGD. L. NO. 7243 PHONE: 808

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1974ء

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۳ء

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ پچاس پیسہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

پاکستان ـــ سالانہ ـــ پندرہ روپے

غیر ممالک ـــ سالانہ ـــ ڈیڑھ پونڈ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی۔ گلبرگ ۲، لاہور

قیمت فی پرچہ

ڈیڑھ روپیہ ۱½

جلد (۲۷)

جنوری ۱۹۷۴ء

نمبر (۱)

فہرست

۱۔ لمعات ۲

۲۔ خریدارانِ طلوعِ اسلام کے لئے ضروری اعلان ۸

۳۔ روئیداد طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۳ء (محترم غلام صابر صاحب) ۹

۴۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کا عمل نامہ (محترم محمد اسلم صاحب) ۲۱

۵۔ اعمال نامہ (محترم پرویز صاحب) ۲۵

۶۔ قرآنِ مجید کی تحریف (محترم پرویز صاحب) ۵۳

۷۔ عیدِ آزاداں۔ عیدِ محکوماں (محترم پرویز صاحب) ۵۹

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس۔ ایبک روڈ۔ لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

لمعات

للہ الحمد کہ مدت کے بعد اس غمکدہ میں خوشی کی ایک خبر موصول ہوئی۔ وہ خبر جو باعثِ تازگیٔ روح اور وجہِ کشادِ قلب ہے۔ وہ خبر یہ ہے کہ عنقریب پاکستان میں مسلم ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہوگی۔ یہ خبر دو وجوہات سے ہمارے لئے وجہِ تسکینِ خاطر ہے۔ ایک تو اس لئے کہ مسلمانوں کی مختلف مملکتیں ایک مقصد کے لئے ایک نقطہ پر جمع ہو رہی ہیں۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس اجتماعیت کے اہتمام کی سعادت مملکتِ پاکستان کے حصے میں آ رہی ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے وقت کم و بیش تمام مسلم ممالک نے اس مملکت کی تخلیق پر مرحبا کہا تھا اور پاکستان کو اپنا امام تسلیم کر لیا تھا۔ ازاں بعد ہماری غلطیوں کی وجہ سے ہمارے اس مقام میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی اور اس طرح ان کی نگاہوں میں ہمارا وقار اور احترام کم ہوتا چلا گیا۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس اجتماع سے کسی حد تک ہمارا وقار پھر بحال ہو جائے گا۔ بشرطیکہ ہم ان کی مہمان نوازی میں ان کے معیار پر پورے اُترے۔ ہمارے عرب بھائی اس باب میں بالخصوص بڑے نازک طبع اور ذکی الحس واقع ہوئے ہیں۔

ان الفاظ کی تسطیر کے وقت تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مجوزہ کانفرنس میں کون کون سے ممالک شریک ہو رہے ہیں۔

وزیرِ اعظم محترم نے یہ کہا ہے کہ اس میں الجیریا سے لے کر انڈونیشیا تک کے ممالک کی شرکت کی توقع ہے۔ آپ نقشے کو سامنے لائیے اور دیکھئے کہ الجیریا سے انڈونیشیا تک کے مسلم ممالک میں رنگ، نسل، زبان، وطن کے کس قدر اختلافات پائے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان گوناگوں اختلافات کے باوجود ان سب میں وہ کون سی قدرِ مشترک ہے جو ان میں اس قسم کی وحدت کا موجب ہے۔ اور اس کانفرنس میں کسی ایسی مملکت کو دعوتِ شرکت نہیں دی گئی جس کا اس قدر میں اشتراک نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ یہ تمام ممالک اسلام کے ساتھ اپنی نسبت رکھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ سب مسلمان ہیں۔ اور اس اجتماع میں کسی غیر مسلم کو شریک نہیں کیا جا رہا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس ایک اقدام سے دو قومی نظریہ کس طرح ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ یہ ممالک "اسلام کی طرف منسوب ہیں"۔ اس "نسبت" میں بھی ابھی یہ جاذبہ موجود ہے کہ اس سے مسلم اور غیر مسلم میں حدِ امتیاز پیدا ہو جاتی ہے۔ سوچئے کہ اگر ہم فی الحقیقت اسلام کے پیرو ہوں تو ہماری یہ وحدت کس قدر محکم حقیقتِ ثابتہ بن جائے گی۔ اور دین کا یہ بنیادی اصول کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک امت یا ایک قوم کے افراد ہیں اور کوئی غیر مسلم اس قومیت میں شریک نہیں ہو سکتا کس طرح عملی شکل اختیار کر لیگا۔

علامہ اقبالؒ نے مدت ہوئی کہا تھا کہ

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں۔

اُس وقت ملک کے جانے سے ملت کی آنکھیں کھلی تھیں یا نہیں لیکن یہ واضح ہے کہ اس وقت اسرائیل اور اسکے

حمایتی جس طرح مسلمانوں کے ممالک چھیننے کے درپے ہیں اُس سے اگر ہماری آنکھیں پوری طرح نہیں کھلیں تو کم از کم نیم وا ضرور ہو گئیں ہیں۔ اُسی زمانے میں اقبالؒ نے یہ بھی کہا تھا کہ

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

یہ امر موجبِ تاسف ہے کہ اُس زمانے میں مسلمان طوفانِ مغرب سے بھی مسلمان نہ ہو سکا۔ لیکن مسلم مملکتوں کیخلاف اب جو تلاطم پیدا ہو رہا ہے ہو سکتا ہے کہ اس سے اقبالؒ کی وہ پیش گوئی پوری ہو جائے۔ وہ جو ہمارے ہاں ایک پرانی بات مشہور ہے کہ

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

تو شاید دشمنانِ اسلام کی اس قدر متحدہ اور کھلی ہوئی عداوت ہمارے لئے سببِ خیر بن جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت یہ ایک ہنگامی حادثہ ہے جس کی مدافعت کی تدابیر سوچنے کے لئے مسلم ممالک میں اس قسم کی وحدتِ فکر و عمل پیدا ہوئی ہے لیکن کیا عجب ہے کہ یہی ہنگامی حادثہ ان ممالک میں مستقل وحدت کا سبب بن جائے۔ خدا کرے کہ ان ممالک کے سربراہوں کے دل میں یہ بات اُتر جائے کہ جس اسلام کی طرف ہم اپنی نسبت رکھتے ہیں اُس کا بنیادی اصول وحدتِ امت تھا۔ یہی اصول دین کی اساس تھا اس وحدت میں تفرقہ قرآن کی رُو سے شرک قرار دیا گیا تھا۔ اور تفرقہ پیدا کرنے والوں کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ ان کا نہ خدا سے کوئی تعلق رہ سکتا ہے نہ اُس کے رسول سے کوئی واسطہ۔ خود ختمِ نبوت کا عقیدہ اس وحدت پر ابدی مہرِ تصدیق ثبت کرتا تھا۔ اگر ایک نبی کے پیرو بھی ایک امت نہیں بن سکتے تو پھر وحدتِ امت کی دنیا میں کوئی اور بنیاد وجود میں نہیں آ سکتی۔ اسلام میں وحدتِ امت کی بنیاد وحدتِ فکر پر ہے ۔۔۔ اسی کو ایمان کا اشتراک کہا جاتا ہے ۔۔۔ اور وحدتِ فکر ہی وحدتِ عمل کی بنیاد بن سکتی ہے۔

موجودہ اسرائیلی حادثہ سے متاثر ہو کر عربی ممالک نے وحدتِ عمل کے لئے ایک ہلکا سا قدم اٹھایا ہے یعنی تیل کی سپلائی میں کمی کرنے کا فیصلہ۔ آپ دیکھیے کہ اس نہایت خفیف سے اجتماعی عمل نے کس طرح یورپ اور امریکہ کی فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔ آپ سوچیے کہ اگر اہم سیاسی امور میں مسلم ممالک کے فیصلوں میں وحدت پیدا ہو جائے تو آج کس طرح دنیا کا نقشہ بدل جائے۔ الجیریا سے انڈونیشیا تک ایسا وسیع و عریض خطۂ زمین ہمارے قبضے میں ہے جسے کرۂ ارض کا مرکز کہا جا سکتا ہے۔ اس میں قوت اور دولت کے بے بہا ذخائر موجود ہیں۔ اس کی آبادی اُن باشندوں پر مشتمل ہے جن کے شہروں، قصبوں، دیہاتوں، پہاڑوں، جنگلوں، صحراؤں میں دن میں پانچ مرتبہ بآوازِ بلند ایک انقلاب آفریں نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ یہ کہ کبریائی کا حق خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں، حکومیت اُس کی اور صرف اُس کی جائز ہے۔ اور یہ پیغام ہمیں اُس ذاتِ اقدس و اعظم کی زبانِ مبارک سے ملا ہے جو اس خدا کا آخری نبی اور پیغامبر ہے۔ اس اعلان کے الفاظ میں کہیں کوئی اختلاف نہیں۔ کوئی افتراق نہیں۔ ان ممالک کی مقامی زبانیں کچھ بھی ہوں یہ اعلان اُسی زبان میں فضائے عالم میں نشر ہوتا ہے جس میں یہ خدا کی طرف سے ملا تھا۔ جسے اُس کے رسولؐ نے دنیا کے انسانوں کو دیا تھا اور جو اُس زمانے میں (حضرت) بلالؓ کے حلق سے بلند ہوتا تھا حالانکہ وہ خود عرب کے نہیں، حبشہ کے رہنے والے تھے۔ قرآن کریم بھی آج تک اسی زبان میں متواتر چلا آ رہا ہے اور دنیا کا ہر مسلمان اُسے اُسی زبان میں پڑھتا ہے۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے کہ آجکل عربی بولنے والے ممالک میں بھی روزمرہ کی زبان میں مقامی رنگ کی وجہ سے نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن

ان تمام ممالک میں علمی زبان وہی ہے جو قرآن کی زبان ہے۔ سوچئے کہ اگر ہمارے تحت الشعور میں پیوست یہ نقوش وحدتِ امت کے ترجمان نہیں تو اور کیا ہیں، اور اس کے بعد یہ سوچئے کہ اگر وہ امت جن کا ان الفاظ میں اشتراک ہے۔ ان الفاظ کے مفہوم پر بھی متفق اور ہم آہنگ ہو جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہو؟

جیسا کہ نظر آتا ہے، اس کانفرنس میں حالیہ سیاسی مسائل ہی زیرِ بحث آئیں گے، لیکن اگر کوئی اللہ کا بندہ اس تقریب سے فائدہ اٹھا کر ان مقتدر رہنماؤں کے سامنے یہ حقیقت لے آئے کہ اسلام میں قومیت کی تشکیل کی بنیاد دین کا اشتراک ہے، اس معیار کے مطابق تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں تو اس سے یہ ہنگامی اجتماع ایسے مستقل مفاد کی بنیاد بن سکتا ہے جو ہمارے ہی کیا، دنیا کے کسی دانشور کے تصور میں نہیں آ سکتے۔ مستقل مفاد صرف مسلمانوں کے نہیں، عالمگیر انسانیت کے۔ ہم مجوزہ کانفرنس کے اربابِ نظم و نسق سے گزارش کریں گے کہ وہ کانفرنس ہال میں قرآن مجید کی وہ آیات جن میں وحدتِ امت کو دین کی اساس بتایا گیا ہے۔ وہ احادیثِ نبویؐ جن میں جماعت سے وابستگی کو اسلام کی شرط قرار دیا ہے، جلی اور نہایت خوبصورت حروف میں مرتب کر کے جابجا آویزاں کر دیں تو اس سے مندوبین کی نگاہوں کے سامنے ہر وقت دین کی یہ اصل آتی رہے گی۔ اور چونکہ حسنِ اتفاق سے یہ اجتماع اُس شہر (لاہور) میں منعقد ہو رہا ہے جس کی فضائیں ہمارے حکیم الاُمّت کی قرآنی دعوت سے ابھی تک کیف بار ہیں، اس لئے اگر ان آیاتِ جلیلہ اور احادیثِ مقدسہ کے ساتھ اقبالؒ کے موزوں اشعار اور ان کا عربی ترجمہ بھی زینتِ دہ ایوان کر دیا جائے تو یہ بھی اس مقصد کے بروئے کار لانے میں بڑے ممد و معاون ثابت ہو سکیں گے۔ مثلاً اس قسم کے اشعار

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے   نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا   ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی   اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

یا مثلاً:-

یہ ہندی وہ خراسانی یا افغانی وہ تورانی   تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے   تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

* * *

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہماری آنکھوں کے سامنے وہ عظیم اجتماع آ رہا ہے جو لگ بھگ انہی دنوں جب یہ کانفرنس منعقد ہو گی اُس ارضِ پاک میں منعقد ہو رہا ہے جسے اس اُمت کے لئے مرکزِ محسوس قرار دیا گیا تھا یعنی حج کا اجتماع۔ اس اجتماع میں بھی نجیریا سے لے کر انڈونیشیا تک کے مسلم ممالک کے باشندے یکجا ہوتے ہیں۔ وہ بھی رنگ، نسل، زبان، وطن کے اختلاف کے باوجود وہاں ایک ہی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ وہ سب عربی زبان میں مشترک دعائیں دہراتے ہیں۔ مناسکِ حج کی ادائیگی میں ان کے عمل میں بھی وحدت نظر آتی ہے حتیٰ کہ وہاں لباس تک کا اختلاف بھی مٹا دیا جاتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اس اجتماعِ عظیم کی موجودگی میں جس میں ان ممالک کے لاکھوں افراد والہانہ انداز سے شریک ہوتے ہیں اس اجتماعِ صغیر کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی جو لاہور میں منعقد ہو رہا ہے، بات ابھر کر سامنے آ جائے گی۔ ہمارے ہاں ہر محراب و منبر سے صبح و شام یہ آوازیں بلند ہوتی ہیں، اور ان کی صدائے بازگشت ہر اسٹیج سے سنائی دیتی ہے کہ اسلام میں مذہب و سیاست میں ثنویت نہیں۔

لیکن غور کیجئے کہ مکے کا اجتماع اور لاہور کی کانفرنس اگر ہمارے اس دعویٰ کی عملی تردید نہیں تو اور کیا ہے۔ مکہ کا اجتماعِ حج ایک مذہبی فریضہ قرار پا گیا ہے جس میں امورِ سیاست کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا اور لاہور کی کانفرنس خالص سیاسی اجتماع ہے۔ کیا یہ ثنویت ہمارے منہ پر تھپڑ مارنے کے لئے کافی نہیں؟ اُس اجتماع میں دنیاوی امور کے متعلق کوئی بات نہیں کی جا سکتی اور اس اجتماع میں کوئی یہ نہیں کہے گا کہ زیرِ نظر مسائل میں خدا کی کتاب کا فیصلہ کیا ہے۔ دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ دین و دنیا میں تفریق اور مذہب و سیاست کی علیحدگی ہوتا ہے۔ جب اسلام دین تھا تو حج کا اجتماع ایک مذہبی فریضہ نہیں تھا بلکہ خود دین کا تقاضا تھا۔ حج ۹ھ میں فرض ہوا اور اس میں سربراہِ مملکتِ اسلامیہ حضور نبی اکرمؐ کے نمائندۂ خصوصی کی زبان سے وہ اعلان ہوا جو سورۃ توبہ کی ابتدائی آیات میں محفوظ چلا آ رہا ہے۔ وہ اعلان (دورِ حاضر کی اصطلاح میں، خالص پولیٹیکل اعلان تھا) اس کے بعد آپ خلافتِ راشدہ (بالخصوص عہدِ فاروقی) میں دیکھئے۔ حج کے اجتماع میں مختلف علاقوں کے نمائندگانِ حکومت جمع ہوتے تھے۔ ان کے باہمی مشورے سے جن کی سربراہی خود امیر المومنین کرتا تھا، اہم امورِ مملکت کے فیصلے ہوتے تھے۔ "کھلی کچہری" لگتی تھی جس میں افرادِ امت کی شکایات سنی جاتی تھیں۔ اور وہیں ان کا ازالہ کر دیا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں سیاسی امور کے لئے الگ کانفرنسیں منعقد کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔

اجتماعِ حج تو ایک طرف اُس زمانے میں مساجد اور اُن میں اجتماعاتِ صلوٰۃ بھی محض "مذہبی فریضہ" نہیں ہوتے تھے۔ مساجد اُمت کے اجتماعی مراکز ہوتی تھیں اور ان میں تمام امورِ سیاستِ مُدن طے پاتے تھے۔ مذہب اور سیاست کی تفریق تو دورِ ملوکیت کی ایجاد ہے جو اب تواتر کی سند سے عین اسلام بن چکی ہے۔ اب نہ مساجد میں دنیا کی باتیں کرنا جائز سمجھا جاتا ہے نہ اجتماعِ حج میں سیاسی امور پر بحث و تمحیص مشروع قرار پا سکتی ہے۔ دوسری طرف ہماری سیاسی کانفرنسیں ہیں جن کا افتتاح تو قرآن کی رسمی تلاوت سے ہوتا ہے لیکن جن کے فیصلوں میں قرآن کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مملکتِ پاکستان دنیا اور دین کی اسی ثنویت کو مٹانے کے لئے حاصل کی گئی تھی۔ لیکن ہماری بدنصیبی کہ اس میں اُس ثنویت کا مٹنا تو ایک طرف، اُس کی خلیج اور بھی وسیع ہو گئی ہے ـــ وسیع ہی نہیں بلکہ بے حد مکدر ـــ اب ہم نہایت فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے اتنے ہزار حاجیوں کے لئے ضروری انتظامات کئے ہیں تاکہ وہ وہاں "مذہبی فریضہ" ادا کر سکیں اور دوسری طرف اُسی فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے مسلم ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کا اس قدر عظیم اہتمام کیا ہے تاکہ وہ جمع ہو کر بعض سیاسی امور پر گفتگو کر سکیں۔ ہمارے ہاں آئینِ مملکت میں یہ شق شامل ہے کہ تمام امورِ مملکت ان حدود کے اندر رہتے ہوئے طے پائیں گے جو خدا کی مقرر کردہ ہیں لیکن اُن مجالسِ قوانین ساز یا ایواناتِ حکومت میں جن میں امورِ مملکت طے پاتے ہیں کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ جس معاملہ پر ہم گفتگو کر رہے ہیں اس کے بارے میں خدا کی مقرر کردہ حدود کیا ہیں۔ جس مقصد کے لئے یہ مملکت حاصل کی گئی تھی اگر وہ ہمارا نصب العین رہتا تو ہم دنیا کے سامنے اس امر کی مثال پیش کر سکتے کہ اسلام میں مذہبی اجتماعات اور سیاسی کانفرنسیں الگ الگ نہیں ہوتیں۔

بہرحال ہماری دعا ہے کہ مجوزہ کانفرنس اپنے مقاصد میں کامیاب ہو اور امت میں وحدت پیدا کرنے کی طرف کوئی مثبت قدم اٹھانے کا پیش خیمہ۔

(۲)

ہمارا بدنصیب ملک اُس خلفشار کے ہاتھوں جو اِس وقت ہمہ گیر ہو رہا ہے اگر آخری تباہی سے بچ بھی گیا تو

جو قوم ہم اس وقت اپنی درسگاہوں میں تیار کر رہے ہیں اس کے ہاتھوں کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکے گا۔ خدا معلوم وہ کون تھا جس نے ہماری درسگاہوں میں (UNIONS) کا تصور دیا تھا۔ مختلف تجارتی یا صنعتی اداروں میں ملازموں کی (UNIONS) کا خیال تو قابلِ فہم ہے کیونکہ اس میں مالکوں اور ملازموں کے مفادات میں ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے اور ملازم اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اجتماعی اقدامات ضروری خیال کرتے ہیں۔ (اگرچہ اس وقت یہ اجتماعی اقدامات جو نتائج مرتب کر رہے ہیں وہ بھی تعمیری کی بجائے تخریبی زیادہ ہیں) لیکن بہرحال ان (UNIONS) کا تصور قابلِ فہم ہے لیکن کالجوں میں طلباء کی یونینز کا تصور .... ہمارے فہم سے بالاتر ہے۔ کیا ان درسگاہوں میں طلباء اور اساتذہ کے مفادات میں تصادم ہوتا ہے جس کے لئے طلباء اپنی اجتماعی تنظیمات ضروری سمجھتے ہیں۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ بڑا مقدس سمجھا جاتا تھا جس کا ایک سرا شفقت اور دوسرا سرا احترام کی گلپوش شاخوں سے بندھا ہوا ہوتا تھا۔ ان میں تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری درسگاہوں کی یونینز بھی طلباء کے مفاد کے لئے تنظیمی کوششیں نہیں ہیں۔ یہ درحقیقت مختلف سیاسی پارٹیوں کی ذیلی تنظیمیں ہیں اور ان میں وہی کچھ ہوتا ہے جو ان کی سربراہ پولیٹیکل پارٹیوں میں ہوتا ہے۔ پولیٹیکل پارٹیوں میں تو لیڈروں کو بڑی عمر میں جا کر وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جسے اگر وہ اپنی نجی زندگی میں کریں تو کوئی شخص انہیں کرایہ پر مکان تک دینے کے لئے بھی رضامند نہ ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ پارٹیاں اپنے وقتی مفاد کی خاطر ان معصوم بچوں کے قلب و دماغ کو بھی انہی خباثتوں سے آلودہ کئے جا رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ان بچوں کے سامنے زندگی کی کوئی بلند اقدار ہوں، یہ میکیاولی سیاست کے ایکسپرٹ بن کر درسگاہوں سے نکلتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ جب یہی بچے کل کی قوم بنیں گے تو ان کے ہاتھوں اس ملک کا حشر کیا ہو گا؟ اس دفعہ مختلف یونینز کے انتخابات میں اسلامی جمعیتِ طلباء کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس کامیابی پر مختلف گوشوں میں جس قسم کے تاثرات کا اظہار ہو رہا ہے اس کا اندازہ ایک اخبار کے حسب ذیل شذرہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ لکھا ہے۔

> پنجاب یونیورسٹی یونینز کے انتخابات میں اسلامی جمعیت طلبہ جیت گئی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ جن نوجوانوں کی ہار ہوئی وہ کون تھے۔ ہمارے نزدیک اصل سوال اس ذہن کا ہے جو طلباء کے فکری مزاج کا عکاس ہے کیا اس جیت کے بعد ایک دفعہ یہ بات پھر ثابت نہیں ہو گئی کہ نئی پود پاکستان کے مستقبل کو اسلام کے آئینہ میں دیکھتی اور اسلام ہی سے اپنی وفاداری رکھتی ہے۔

ان تنظیمات اور ان کی انتخابی کامیابیوں سے اس قسم کا نتیجہ مستنبط کرنا اگر مغالطہ آفرینی نہیں تو غلط نگہی ضرور ہے۔ طلباء کی کسی جمعیت کے ساتھ لفظِ اسلام کا اضافہ اس امر کی دلیل یا ثبوت نہیں ہو سکتا کہ اس جمعیت کے ارکان کے قلب و دماغ اسلامی فکر کے عکاس ہیں اور وہ جمعیت اسلامی تعلیم کی پیکر۔ اگر آپ اس قسم کی اسلامی تنظیمات کے افراد کا ذرا گہرائی میں جا کر جائزہ لیں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ یہ نوجوان اسلامی فکر و نظر سے اسی طرح بے بہرہ ہوتے ہیں جس طرح کسی سوشلسٹ تنظیم سے وابستہ طلباء سوشلزم کے حقیقی نظریات سے بیگانہ۔ لہٰذا کسی اسلامی جمعیت کے طلباء کی انتخابی کامیابی ملک میں اسلام کے مستقبل کی درخشندگی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اسلام کا نام لے کر ہمارے یہ نونہالانِ ملت جو کچھ کرتے ہیں اس سے ہے سبب اسلام کا مستقبل بھی بڑا مخدوش نظر آتا ہے۔ اگر اس ملک کی وہ پارٹیاں تنظیمیں جمعیتیں اور جماعتیں جو اپنے ساتھ اسلام کا لفظ چپکائے ہوتے ہیں، صحیح معنوں میں اسلامی ہوتیں تو

وہاں کا یہ حشر ہوتا نہ ملک کی یہ حالت۔ اسلامی زندگی بسر کرنے والا تو ایک فرد بھی روشنی کے مینار کی طرح محکم اور ضوپاش ہوتا ہے چہ جائیکہ ایک پوری کی پوری جماعت صحیح معنوں میں اسلامی ہو اور تاریکیاں پھر بھی دن بدن بڑھتی جائیں۔

یہ سب میکیاولی سیاست کے مختلف بہروپ ہیں اور القاب کے الفاظ ہیں)

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

طلباء کی اس قسم کی جمعیتوں سے نقصان اتنا ہی نہیں کہ ملک میں خلفشار عام ہو رہا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ نقصان یہ ہے کہ ان بچوں کے ذہن میں اسلام کا جو تصور راسخ کیا جا رہا ہے وہ بڑا ہی غیر اسلامی اور تباہ کن ہے۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ "زندگی کی اہم ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہوتا ہے۔" انہیں یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ اسلام کی رُو سے حکمتِ عملی کے ماتحت زندگی کے ہر بلند اصول سے انحراف برتا جا سکتا ہے۔ ان کے دل میں یہ خیال راسخ کیا جاتا ہے کہ تم صالحین کی جماعت ہو جس کا دینی فریضہ قوت کے زور پر اقتدار کی کرسیاں حاصل کرنا ہے۔ اُن سے کہا جا رہا ہے کہ تمہاری جنگ جہاد ہے اور جنگ میں ہر قسم کا حربہ استعمال کرنا باعثِ ثواب ہوتا ہے۔ سوچئے کہ جب ان بچوں کا ناپختہ ذہن اس قسم کے قالبوں میں ڈھالا جائے اور انہیں عین اسلامی قرار دیا جائے تو ان کے ہاتھوں اس ملک اور خود اسلام کا کیا حشر ہو گا۔ اگر کبھی کوئی خدا کا بندہ ایسا اٹھا جس کے دل میں اسلام کا درد اور اس ملک کی حفاظت اور بہبود کا جذبہ راسخ ہو تو اس کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہو گا کہ وہ ہماری درس گاہوں میں صحیح قرآنی نصابِ تعلیم رائج کرے۔ طلبا اور اساتذہ میں شفقت اور احترام کا رشتہ استوار کرے۔ ان یونینز کا زہرافشاں تماشہ ختم کرے اور طلبا کی تمام توجہات اور مساعی کو حصولِ علم کے نصب العین پر مرکوز کر کے عملی سیاست میں ان کا حصہ لینا ممنوع قرار دے۔ اسی سے اس ملک کا مستقبل محفوظ ہو سکیگا۔

(۳)

طلوعِ اسلام کی سابقہ کنونشن میں پرویز صاحب کے خطابات نے فضا کو بڑا متاثر کیا ہے۔ دسمبر کی اشاعت میں ان کا پہلا خطاب شائع کیا گیا تھا اور اشاعتِ حاضرہ میں ان کا دوسرا خطاب شائع کیا جا رہا ہے جس کا عنوان ہے "اعمال نامہ"۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس کے مطالعہ کے بعد قارئین خود لگا سکیں گے۔ ان کا تیسرا خطاب آئندہ پرچے میں شائع کیا جائیگا۔ یہ خطاب بڑے اہم، اصولی نکات کو سامنے لاتا اور پاکستان کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان خطابات کی اہمیت کے پیشِ نظر انہیں پمفلٹوں کی شکل میں بھی شائع کیا گیا ہے۔

(۴)

ایک ضروری اعلان اور ہے۔ پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف ــ شاہکارِ رسالت ــ کو ملک میں جو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اس کے پیشِ نظر یہ دکھائی دیتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن بہت جلد ختم ہو جائے گا اور ملک میں کاغذ کی کمیابی (اور بعض حالات میں نایابی) کے پیشِ نظر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت میں کتنا وقت لگ جائے گا۔ اس لئے خواہشمند حضرات کو یہ کتاب جلد حاصل کر لینی چاہیئے تاکہ انہیں مایوس نہ ہونا پڑے۔

(ط۔ا)

خریدارانِ طلوعِ اسلام کیلئے

ضروری اعلان

(۱) ملک میں پھیلی ہوئی ہوش ربا گرانی کی وجہ سے طلوع اسلام کی مالی حالت پر جو نقصان رساں اثر پڑ رہا تھا ہم کسی نہ کسی طرح اس کا مقابلہ کئے جا رہے تھے۔ ہماری کوشش یہی تھی کہ ہم طلوع اسلام کے خریداروں پر مزید بوجھ کا باعث نہ بنیں۔ لیکن آخر الامر یہ بار ہماری حدِ برداشت سے باہر ہو گیا اور اس میں بادلِ نخواستہ طلوع اسلام کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑا۔ اس کا اعلان طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں ایک چٹ کے ذریعے کیا گیا تھا جسے رسالہ کے پہلے صفحے پر چسپاں کر دیا تھا۔ حالیہ اشاعت میں اس کا دہرانا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ فیصلہ یہ ہے کہ یکم جنوری ۱۹۷۴ء سے رسالہ کا سالانہ چندہ دس روپے کی بجائے پندرہ روپے ہوگا۔ اور ایک پرچہ کی قیمت ایک روپیہ کی بجائے ڈیڑھ روپیہ۔ امید ہے ہمارے قارئین ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہوئے اس اضافہ کو بطیب خاطر برداشت کر لینگے۔

(۲) جو رسالے یورپ یا امریکہ بھیجے جاتے ہیں پچھلے کئی ماہ سے شکایات موصول ہو رہی ہیں کہ اُن کی کثیر تعداد قارئین تک نہیں پہنچ رہی۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہم اس کا اصلی سبب معلوم کر سکیں لیکن شکایت موصول ہونے پر مطلوبہ پرچوں کو دوبارہ بھیجنا پڑتا ہے جن پر ڈاک کا مزید خرچ بھی آ جاتا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان ممالک میں بھیجا جانے والا ہر پرچہ بصیغۂ رجسٹری بھیجا جائے تاکہ وہ یقینی طور پر خریداروں تک پہنچ سکے۔ یکم جنوری سے ان ممالک میں سالانہ چندہ ایک پونڈ کی بجائے ڈیڑھ پونڈ ہوگا۔ متعلقہ احباب اسے نوٹ فرمالیں۔

جن خریداروں کا چندہ اس سے پہلے ایک پونڈ سالانہ کے حساب سے موصول ہو چکا ہوا ہے پرچہ انہیں بھی رجسٹری ڈاک سے بھیجا جائے گا۔ اگر اُن کے حساب کے کھاتے موجود ہیں تو رجسٹری کا خرچہ اس میں محسوب کر لیا جائے گا۔ جن کے کھاتے موجود نہیں اُن سے یہ حساب چندہ کی تجدید کے وقت کر لیا جائے گا۔ اس سے ہر خریدار تک پرچہ امکانی حد تک یقینی طور پر پہنچ جائے گا۔ اس سے انہیں اور ہمیں دونوں کو موجودہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روئیداد

مرتبہ:- غلام صابر

طلوعِ اسلام کنونشن

منعقدہ — ۲۲ر لغایت ۲۵ر نومبر ۱۹۷۳ء

سحر کے اجالوں کا پیغام ہیں یہ،
اندھیروں سے کیوں تم گھبرا رہے ہو

آجکل ویسے تو ساری دنیا میں انسان انتشار و خلفشار کے شعلوں میں جھلس رہے ہیں لیکن پاکستان میں مایوسی و ناامیدی کی سیاہ گھٹائیں چاروں جانب سے اس طرح فضا کو محیط ہیں کہ کشادگی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ پچھلے تین سالوں کی ہنگامہ آرائیاں، قتل و غارت، ملک کے ٹوٹ جانے کا سانحہ اور سیلاب کی تباہ کاریاں، اس پر ہوشربا گرانی ہر پاکستانی کو مایوسی اور نااُمیدی کے خوفناک گرداب میں نڈھال کر رہی ہیں اور اگر کچھ لوگ اُمید کے دامن کو تھامے ہوئے ہیں تو وہ محض اپنے جذباتی رجحانات اور افتادِ طبع کی بنا پر — ورنہ جذبات کے ساتھ ساتھ کسی فکری، نظری اور واضح نصب العین کی بنیاد پر امید کی کرنوں کا نور حلقۂ طلوع اسلام کے احباب کے سوا اور کہیں موجود نہیں — پوری قوم اپنے جذبات کے بھنور میں ہے۔ ان میں کچھ مایوس اور کچھ امید پرستی کے فریب کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔ طلوع اسلام کنونشن کے اجتماعات قوم کی اس جذباتی کیفیت کو فکر و نظر کی روشنی سے توازن بدوش بنانے کی نہایت پاکیزہ، شُستہ اور پُرتاثیر کوشش ہوتی ہے۔ اِس جدوجہد میں ملک کے گوشے گوشے سے اور بیرونِ ملک کے دور دراز علاقوں سے احبابِ قرآنی پورے جذب و شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ اور نہ صرف پاکستان میں بلکہ عالمِ انسانیت پر چھائے ہوئے اندھیروں کو ختم کرنے کی کوشش سے دلوں میں اعتماد اور حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کی تگ و تاز سحر کے اجالوں کی پیامبر بن جاتی ہے — امسال یہ اجتماعات ۲۲ر لغایت ۲۵ر نومبر ۱۹۷۳ء، ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ کے سامنے وسیع و عریض سبزہ زار میں منعقد ہوئے۔

بزموں کا پہلا غیر رسمی اجلاس

تلاوتِ قرآن ـــــــ محترم خواجہ محمد معظم صاحب
کلامِ اقبالؒ ـــــــ محترم مرزا محمد خلیل صاحب
سٹیج سیکرٹری ـــــــ محترم خالد سلام صاحب

آج (۲۲ نومبر) جمعرات کی شام بوقت چھ بجے، احباب کواپریٹو و قرآنک سوسائٹی کا اجلاس تھا۔ اس میں محترم ظفر احسن محمود صاحب (سیکرٹری احباب کواپریٹو سوسائٹی) اور محترم شیخ سراج الحق صاحب (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) نے اپنی اپنی سالانہ رپورٹیں پیش کیں جن میں بتایا کہ تعلیماتِ قرآنی کے مجوزہ مرکز اور رہائشی کالونی کے لئے زمین حاصل کرنے کی مساعی کس حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔ اس کے بعد شام کے کھانے کا اعلان ہوا۔ اور کھانے کے بعد محترم خالد سلام صاحب نمائندہ بزم طلوعِ لاہور نے اعلان کیا کہ بزموں کا ایک غیر رسمی تعارفی اجلاس منعقد ہوگا۔ بزم لاہور کے رفیق محترم خواجہ محمد معظم صاحب نے تلاوتِ قرآن فرمائی۔ اور محترم مرزا محمد خلیل صاحب نے کلامِ اقبالؒ کی اس غزل سے احباب کی دل و نگاہ کی تپش کو آنسوؤں میں بدل دیا۔

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی
تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

محترم خالد سلام صاحب نے اس تعارفی اجلاس کے بارے میں اعلان کیا کہ فرداً فرداً مختلف مقامات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں دقت پیش آتی ہے، اس لئے اجتماعی طور پر تمام احباب ایک دوسرے سے متعارف بھی ہو جائیں اور اپنے اپنے مقامات کے بارے میں بھی بتائیں کہ وہاں انہیں قرآنی تبلیغ میں کیا کیا آسانیاں اور کیا کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔ کیا مشکلات بڑھ گئی ہیں، طریق کار میں تیزی کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔ خالد سلام صاحب کے بعد بلوچستان سے آئے ہوئے دیرینہ قرآنی جاں نثار جن کی دلسوزی اُن کے لب و لہجہ سے عیاں ہو جاتی ہے یعنی محترم نذیر احمد خان صاحب نے تفصیلاً سرزمین بلوچستان میں اپنی کارکردگی کے بارے میں وضاحت سے بیان کیا۔ اس کے بعد صوبہ سرحد، سندھ اور پنجاب کے احباب نے اپنے اپنے طور پر اظہارِ خیال کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے عزم و یقین کے یہ پیکر اپنی اپنی بساط سے بڑھ کر حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں اور کامیابیاں ان کی ہمتوں کے در و دیوار پر دستک دے رہی ہیں ـــ یہ اجلاس رات گئے تک جاری رہا۔ اجلاس ختم ہوا تو احباب سردی میں ٹھٹھرتے، سکڑتے لیکن مسکراتے ہنستے خواب گاہ کی جانب بڑھے ـــ امسال بھی محترم پرویز صاحب کے دیرینہ ساتھی محترم شیخ سراج الحق صاحب نے اپنی کوٹھی ۱۴/بی کا بیشتر حصہ ان قرآنی جادہ پیماؤں کے لئے وقف کر دیا۔ یہ اُن کے ایثار اور خلوص کی ایک ادنیٰ سی جھلک ہے ـــ خواب گاہ میں جانے سے پہلے ایک فنجان چائے کے تقاضا کو پورا کیا گیا ـــ اس بار بزم لاہور کینٹ کے احباب نے کنٹین کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لے کر بہترین چائے کا انتظام کیا اور محترم مقصود بٹ صاحب نے شبانہ روز محنت سے حسنِ انتظام کو برقرار رکھا۔ کنٹین سے فارغ ہو کر احباب صبح کے اجتماع میں شمولیت کی تڑپ لے کر سو گئے!

جمعہ - ۲۳ر نومبر ۱۹۷۳ء

بزموں کا اجلاس

صدارت ــــــــــــ محترم اقبال سرور صاحب
تلاوت ــــــــــــ محترم اکرم راٹھور صاحب
کلامِ اقبالؒ ــــــــــــ محترم مرزا محمد خلیل صاحب
سٹیج سیکرٹری ــــــــــــ محترم محمد اسلام صاحب

یہ اجلاس صبح ۹ بجے شروع ہوا اور بزم ملتان کے روحِ رواں محترم اقبال سرور صاحب نے اس کی صدارت کی۔ تلاوتِ قرآن محترم محمد اکرم راٹھور صاحب نے کی۔ یہ اکرم صاحب وہی جیالے ہیں جو بزم ڈھاکہ کے نمائندہ تھے اور وہاں قرآنی آواز کو عام کرنے کے لئے بنہایت جذب و انہماک سے ہمہ تن مصروف رہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد یہ اِن دنوں کراچی بزم کے احباب کے ساتھ مل کر اس فریضہ کی ادائیگی کر رہے ہیں۔ اُن کا حسنِ عمل اور حسنِ کلام، قرآن کی آیات کی تلاوت میں سوز و گداز سے بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد محترم پرویز صاحب کے دیرینہ رفیق اور قرآنی اجتماعات کے ہدی خواں محترم مرزا محمد خلیل صاحب نے کلامِ اقبال سے دلوں کے خوابیدہ ولولے تازہ کئے۔ انہوں نے اقبالؒ کی یہ غزل سنائی۔

لا پھر اِک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

اس کے بعد محترم خلیل صاحب نے ناظم ادارہ کی حیثیت سے اپنی رپورٹ پڑھی۔ بزم کراچی کے نہایت متحرک نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب اور تحریکِ پاکستان کے مشہور راہنما اور تحریکِ طلوع اسلام کے مایۂ ناز رفیق بزرگ محترم صدر بجنت جمال خان صاحب نے اس رپورٹ کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔ اس کے بعد تمام بزموں سے کہا گیا کہ وہ اس رپورٹ پر غور کریں اور ادارہ کے ساتھ جو وعدہ بھی کیا جائے، اُسے ہر حال میں پورا کیا جائے۔ اس پر مزید غور کے لئے ایک گھنٹے کا وقفہ دیا گیا تاکہ اراکینِ بزم اپنے اپنے نمائندگان کے ساتھ مل کر مختلف نکات پر باہمی تبادلہ اور فیصلہ کر سکیں۔ وقفہ کے بعد بزموں کے نمائندے باری باری سٹیج پر آئے اور اپنے اپنے فیصلوں سے آگاہ کیا۔ ان میں رسالہ طلوع اسلام کی خریداری اور نئی قیمت، پیشگی خریداری سکیم، کتب کی خرید، محترم پرویز صاحب کے دورے اہم نکات تھے۔ یہ اجلاس دوپہر ۱۲ بجے ختم ہوا۔

یہ اجلاس جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لئے اہتماماً ختم کر دیا گیا تاکہ احباب قریب مساجد میں جا کر نماز جمعہ ادا کر سکیں۔ کھانے اور نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد کنونشن کا پہلا کھلا اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ اس لئے ہر شریکِ محفل رفیق نئے ولولے اور جوش سے اس کے لئے تیاری کر رہا تھا۔

* * *

جمعہ - ۲۳ر نومبر ۱۹۷۳ء - دوپہر دو بجے

پہلا کھلا اجلاس

صدارت ــــــــــ محترم حسن عباس رضوی صاحب
تلاوتِ قرآن ــــــــــ محترم مرزا محمد خلیل صاحب
سٹیج سیکرٹری ــــــــــ محترم محمد اسلام صاحب
کلامِ اقبالؒ ــــــــــ میجر جنرل (ریٹائرڈ) احسان الحق صاحب

چونکہ یہ پہلا کھلا اجلاس تھا، اس لئے سامعین جوق در جوق پنڈال میں داخل ہو رہے تھے ۔۔۔ امید کی کرنوں کے متلاشی احباب نے ٹیکسی ڈرائیوروں کی عام ہڑتال کے باوجود اس اجلاس کو کامیاب بنایا ۔۔۔ محترم مرزا محمد خلیل صاحب نے تلاوتِ قرآن مجید فرمائی اور پھر سٹیج سیکرٹری محترم محمد اسلام صاحب نے اعلان کیا کہ اب اقبالؒ کے مردِ مجاہد سے کلامِ اقبالؒ سنیئے یعنی (ریٹائرڈ) میجر جنرل احسان الحق صاحب جن کی قرآنی فکر کے ساتھ وابستگی بڑی قدیمی ہے۔ محترم احسان صاحب نے بہایت اعتماد اور اس دلکش و پُر تاثر انداز میں کلامِ اقبالؒ پیش کیا جس سے آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک اور چہروں پر جوشِ جذبات کی ہلکی ہلکی سرخی کی روشنی ساری فضا میں پھیل گئی ۔۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ 'مردِ مجاہد' بانگِ لاتخف' اور درختِ طور کے باہمی امتزاج کو دل کی گہرائیوں سے پیدا کرنا چاہتا ہے ۔۔۔ بڑی نرالی فضا کا سماں تھا ۔۔۔ حسنِ انتخاب بھی خوب تھا۔

ڈھونڈ چکا میں موج موج ' دیکھ چکا صدف صدف
مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی ،
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

اس خیال افروز ساعت کے بعد محترم محمد اسلام صاحب نے وہ اعلان کیا جسے سننے کے لئے ہر شریکِ محفل گوش بر آواز تھا۔ یعنی محترم پرویز صاحب کے خطاب کا اعلان ۔۔۔ محترم پرویز صاحب کے مقالہ کا عنوان تھا

" غلامی سے بدتر ہے بے یقینی "

اس مقالہ میں مفکرِ قرآن نے اُن تمام بنیادی اسباب کا ذکر کیا جن کی بنا پر ساری قوم بے یقینی کے عذاب میں مبتلا ہو گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرآنی انقلاب' ہر نوع کے مفاد پرستوں اور طالع آزماؤں کے لئے پیامِ مرگ ہے ۔۔ اور اسے صرف اور صرف احبابِ قرآنی ہی اپنے مخلص ہاتھوں کے بکھیرے ہوئے بیجوں سے ثمر بار کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہمت سے کام لینا ضروری ہے۔

عزمِ سفر کیا ہے تو رختِ سفر بھی باندھ
منزل ہے آسمان تو بے بال و پر نہ جا

چونکہ اُن کا یہ خطاب ماہِ دسمبر ۷۶ء کے شمارہ میں شائع ہو گیا ہے' اس لئے اس کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک گوشے کی طرف نشاندہی ضروری ہے کہ پاکستان کی قومی زندگی میں یہ خطابات فکری طور پر سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔۔۔ لہٰذا ان کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر، ان کا مطالعہ

نہایت انہماک اور پورے فکری شعور سے کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر ادارہ کی طرف سے یہ خطابات الگ پمفلٹوں کی صورت میں بھی شائع کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ اجلاس نماز مغرب تک جاری رہا اور نمازِ مغرب کی ادائیگی کے بعد دوسرے کھلے اجلاس کا اعلان محترم اسلام صاحب نے کیا۔

جمعہ ۔ ۲۳ نومبر ۱۹۷۳ء ۔ ۵½ بجے شام

دُوسرا کھُلا اجلاس

صدارت ———— محترم ڈاکٹر حیات ملک صاحب
سٹیج سیکرٹری ———— محترم خالد سلام صاحب
تلاوتِ قرآن مجید ———— محترم مرزا محمد خلیل صاحب

یوں تو کنونشن کا ہر اجلاس قرآنی پیغام کے عام کرنے کا باعث ہوتا ہے اور ہر شریکِ محفل اس خیال سے ان اجتماعات میں شرکت بھی کرتا ہے۔ ان اجتماعات میں جہاں ملک کا بیشتر دانشور طبقہ شریک ہوتا ہے اور مختلف موضوعات زیرِ بحث آتے ہیں۔ اس کھلے اجلاس میں کئی ایک مقالات پڑھے گئے۔ محترم حسن عباس رضوی صاحب نے "ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ" پر اظہارِ خیال کیا۔ محترم (پروفیسر) علاؤ الدین اختر صاحب نے "اسلامی مملکت میں علم و فکر کی ترقی" پر تفصیلی اظہار کیا اور اس موثر انداز میں کہا کہ ہر سامع سے داد وصول کی۔ محترم چوہدری عطاء اللہ صاحب ایڈووکیٹ نے "نہ ہو نومید" کے زیرِ عنوان اپنے جذبات و خیالات سے محفل کو گرمایا اور کہا کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کی فکری تحریک کی کامیابی کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ اب ہر جگہ علمی مسائل پر بحث اسی تحریک کے انداز میں ہوتی ہے۔ ان کے بعد پاکستان کے مایۂ ناز ادیب اور افسانہ نگار اور قرآنی فکر سے سرشار محترم ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب نے آغاز کلام اس شعر سے کیا۔

ہزار ہم سخنی ہو ہزار ہم فکری
مقامِ جنبشِ ابرو نکل ہی آتے ہیں

ڈاکٹر صاحب کے خیال افروز مقالہ کے بعد محترم محمد اسلام صاحب نے اپنا مقالہ "مودودی صاحب کا تضاداتی اسلام" پیش کر کے سامعین کو حیرت میں ڈال دیا۔ انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ وہ ان تضادات پر مشتمل ایک کتاب لکھ رہے ہیں جو عنقریب شائع ہو جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت اور تقاضے کو پورا کرے گی۔ چونکہ یہ مقالہ بھی طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت دسمبر ۷۳ء میں شائع ہو چکا ہے، اس لئے اس کی تفصیل درج کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ اجلاس رات ۸½ بجے تک جاری رہا۔ اس کے بعد محترم خالد سلام صاحب نے مندوبین کنونشن کو کھانا تیار ہونے کی خوشخبری دی اور سب احباب مطبخ کی طرف بڑھے۔ امسال بھی بزم لاہور کے پرانے

رفیق محترم رشید صاحب نے مطبخ کے تمام انتظامات اس انداز سے مکمل کئے ہوئے تھے کہ سب احباب نے انہیں اُن کی شبانہ روز محنت اور قرآنی خدمت کے جذبۂ صادقہ کے لئے خراجِ تبریک پیش کیا۔ اس کے ساتھ بزم کراچی کے رضاکار احباب کا نظم و ضبط بھی قابلِ صد تحسین تھا۔ سچ یہ ہے کہ بے غرض کارکنوں کی محنت ہی تحریکوں کی زندگی میں خونِ زندگی ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد بزموں کا تیسرا اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔

جمعہ۔ ۲۳ر نومبر ۷۳ء۔ رات ۹ بجے

بزموں کا تیسرا اجلاس

صدر ——— فخرِ سرحد محترم خان بخت جمال خان صاحب
سٹیج سیکرٹری۔ ——— محترم محمدؐ اسلام صاحب
تلاوتِ قرآن کریم ——— محترم خلیل صاحب

پنڈال کی اقامت و آرائش اور سٹیج کی سج دھج کا فریضہ بزم لاہور کے نہایت مخلص رفیق محترم چوہدری محمد لطیف صاحب کے حسنِ ذوق کا رہینِ منت ہے اور اسے بقعۂ نور بنا دینے کا سہرا رفیقِ مکرم، افضل عابد صاحب کے سر۔ ان روشنیوں کی دلفریب جھلمل میں پنڈال سے بزموں کے اجلاس کا اعلان کیا گیا۔ اس اجلاس میں تمام بزموں نے ناظم ادارہ کی سالانہ رپورٹ کے کئی ایک اہم امور پر غور و خوض کیا اور کئی ایک فیصلے بھی کئے گئے۔ اس طرح یہ اجلاس رات گئے تک جاری رہا۔ احباب نے کنٹین سے چائے کا کپ پیا اور فرشِ مخملیں پر نیند کی آغوش میں جانے کے لئے بڑھتے چلے گئے۔ تاکہ صبح کے اجلاس میں تازہ دم شریک ہو سکیں۔

ہفتہ۔ ۲۴ر نومبر ۷۳ء۔ صبح ۹½ بجے

بزموں کا چوتھا اجلاس

صدارت ——— محترم محمد اسلام صاحب
سٹیج سیکرٹری ——— محترم خالد جلال صاحب
تلاوتِ قرآن کریم ——— محترم اکرم راٹھور صاحب

بزموں کے اجتماعات کی غایت تو یہ ہے کہ تمام ہم آہنگ اور ہم فکر احباب فکرِ قرآنی کو عام کرنے کے نئے نئے موثر طریقوں کا سراغ لگائیں۔ نئے نئے راستوں کا تجربہ حاصل کریں تاکہ یہ آواز ہر پاکستانی کے دل کی دھڑکن بن جائے۔ اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بڑے صبر آزما مراحل آتے ہیں۔ لیکن مہر و وفا، خلوص و محبت، سوز و گداز کا سلسلۂ عشق و جنوں، کسی رکاوٹ کو بھی راہ میں حائل نہیں ہونے دیتا۔ بزمہائے طلوعِ اسلام ظاہری شور و غوغا سے ہٹ کر قوم میں فکری جمود و سکوت کی فضا کو نہایت دھیمی قرآنی

صداؤں کے ارتعاش سے مائل بہ حرکت کر رہی ہیں۔ یہ وہ کام ہے جو قوم کی حیاتِ ثانیہ کے لئے مقدمۃ الجیش بن جاتا ہے۔ ان عظیم مقاصد کے حصول کے لئے احباب نے مختلف تجاویز اور مشوروں پر غور و فکر کیا۔ اس کے بعد مفکرِ قرآن کے ساتھ تمام بزموں نے گروپ فوٹو اتروائے۔ کھانے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ مطبخ سے اذن ملا کہ کھانا تیار ہے۔ اس سے فارغ ہوئے تو کنونشن کے تیسرے کھلے اجلاس میں شمولیت کے لئے تمام احباب تیاری کرنے لگے۔

ہفتہ ۲۴ر نومبر ۱۹۷۳ء دوپہر دو بجے

بزمِ مذاکرہ

صدارت ——— محترمہ بیگم رضا علی صاحبہ
سٹیج سیکرٹری ——— محترم پرویز صاحب
تلاوت ——— محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ
کلامِ اقبالؒ محترم احسان الحق صاحب (ریٹائرڈ میجر جنرل)

اس محفل کی اہمیت، نزاکت اور ثقاہت کے پیش نظر، اس کے سٹیج سیکرٹری کا فریضہ محترم پرویز صاحب خود اپنے ذمہ لیا کرتے ہیں۔ انہوں نے اس محفل کے وقار کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ محفل نہایت باوقار اور جاذب ہوتی ہے، اس میں قوم کی بیٹیاں بھی شریک ہوتی ہیں اور قوم کی تہذیب کی بنیاد احترامِ مخدرات ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ احباب طلوعِ اسلام کی محفلوں کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے پاکیزگی اور شائستگی کے دامن کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ اس بار مذاکرے کا موضوع تھا

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے

محترم پرویز صاحب نے کلامِ اقبالؒ کے لئے محترم احسان الحق صاحب کا نام نہایت پرجوش انداز میں پیش کیا۔ انہوں نے کلامِ اقبالؒ کے ان اشعار کو سنا کر نئی بلندیوں کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اس کے بعد مذاکرہ شروع ہوا۔ اس میں عزیزہ سلمیٰ لطیف سے لے کر سلمیٰ پرویز تک مقررین نے حصہ لیا۔ ان کے اسمائے گرامی آئندہ اشاعتوں میں شائع ہو جائیں گے اور مقالات بھی۔ اس لئے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ یہ امر باعثِ صد اطمینان اور موجبِ ہزار افتخار ہے کہ مذاکرہ میں شرکت کرنے والے بچوں اور بچیوں کے معیار میں ہر سال نمایاں بلندی ہوتی جا رہی ہے، اور ان محفلوں کے احترام کا یہ عالم ہے کہ چار پانچ گھنٹے کی ان نشستوں میں اونچی سانس تک کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

ہفتہ۔ ۲۴ نومبر ۱۹۷۳ء۔ رات ۹½ بجے

چوتھا کھُلا اجلاس

مجلسِ استفسارات

مجلس استفسارات کی منفرد کیفیت کا نقشہ الفاظ میں نہیں کھینچا جا سکتا۔ اس میں تو شامل ہو کر ہی اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ محفل اگرچہ نجی سی ہوتی ہے اور محترم پرویز صاحب اپنے نہایت شگفتہ انداز میں سوالات کے جوابات قرآن کی روشنی میں دیتے ہیں ۔ ان کی تفصیل کا ذکر طول طویل ہے لیکن ایک اہم بات جس کا ذکر محترم پرویز صاحب نے کیا، یہ تھی کہ وہ "ختم نبوت" پر ایک نہایت اہم "تحقیقاتی" تصنیف پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ تصنیف وقت کے ایک اہم تقاضا کو پورا کرے گی۔ یہ محفل نصف شب تک جاری رہی۔

اتوار۔ ۲۵ نومبر ۱۹۷۳ء۔ صبح ۹½ بجے

پانچواں کھُلا اجلاس

صدارت ——— (ریٹائرڈ) میجر جنرل احسان الحق صاحب

کلام اقبال ——— محترم خلیل صاحب

تلاوتِ قرآن کریم ——— محترم خلیل صاحب

خطاب ——— محترم پرویز صاحب۔ "جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ"

اس حقیقت سے کوئی بھی صاحبِ نظر انکار نہیں کر سکتا کہ مسائل کو حل کرنے سے پہلے ان کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اگر بغیر سوچے سمجھے مسائل کو حل کرنا شروع کر دیا جائے تو کوئی واضح اور روشن منزل نہیں مل سکتی۔ یہ ہمارا قومی المیہ ہے کہ آج ساری قوم اپنے اجتماعی مسائل کو بغیر سوچے سمجھے حل کرنے پر لگی ہوئی ہے۔ جہالت کے اس طلسم کو توڑنے کے لئے مفکرِ قرآن نے اس محفل میں اپنا خطاب پیش کیا، جس کا عنوان تھا "جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ"۔ وہ اسے اپنے مخصوص انداز میں پیش کر رہے تھے اور نئے نئے خیالات، نئے نئے منصوبے اور مستقبل کو سنوارنے کے لئے نئے نئے احساسات اُبھر اُبھر کر سامعین کے سامنے آ رہے تھے۔ تفصیلات کی ضرورت اس لئے نہیں کہ یہ خطاب بھی عنقریب شائع ہو جائے گا۔

چونکہ رکشا ٹیکسی ہڑتال ختم ہو گئی تھی، اس لئے آج اجلاس کے شروع ہونے سے قبل ہی پنڈال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اربابِ دانش و بینش کا یہ وفورِ شوق اس امر کا آئینہ دار تھا کہ اب قرآن کی آواز کس قدر دلوں کی گہرائی میں اپنا مقام پیدا کر رہی ہے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام اپنی اس سعادت پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔

خطاب کے بعد اپنے صدارتی ارشادات میں جناب احسان الحق صاحب نے قوم کو کسی محکم لنگر سے متمسک رہنے کی اہمیت پر زور دیا۔ اور انتباہ کیا کہ اگر ہم نے قرآن کو اپنی کشتیوں کا لنگر نہ بنایا تو تباہی یقینی ہے۔ اس کے بعد اس نہایت خیال افروز اجلاس کے ختم ہونے کا اعلان کیا گیا اور مندوبین حضرات مطبخ میں دوپہر کے کھانے کے لئے تشریف لے گئے۔

اتوار - ۲۵ نومبر ۱۹۷۳ء - بعد دوپہر

بزموں کا آخری اجلاس

صدارت ـــــــــــــ محترم محمد اسلام صاحب

تلاوت ـــــــــــــ محترم حافظ محمد یونس صاحب

سٹیج سیکرٹری ـــــــــــــ محترم مرزا محمد خلیل صاحب

تحریکِ طلوعِ اسلام کے پیغام کو دور دراز علاقوں میں نہایت مؤثر انداز سے پہنچانے کی تدابیر کے لئے بزموں کا یہ آخری اجلاس تھا۔ اس میں اپنے اپنے علاقے میں کارکردگی پر تنقید بھی کی گئی اور اپنی اپنی کوتاہیوں کا اعتراف بھی۔ یہ اعتراف نئے ولولے کے ساتھ آگے بڑھنے کے جذبات کا تھا۔ خود تنقیدی کے بعد اپنے پرانے راستوں کی خامی کا علم ہوا اور نئے راستوں اور نئی منزلوں کا ادراک بھی۔ محترم قدیر احمد خان صاحب نے ایک اہم امر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں محض مطالعے کی حد تک ہی تحریک سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے اپنی شخصیتوں کا حصہ بنانا نہایت ضروری ہے۔ اس پر تمام احباب متفق بھی تھے اور اپنی رفتار کی سستی کو تیز تر کرنے کے لئے نئے عزائم استوار کر رہے تھے۔

اس کے ساتھ ہی وہ اجلاس بھی منعقد ہوا جس میں محترم پرویز صاحب ان قرآنی پروانوں کو دل پر پتھر رکھ کر نہایت ڈوبی آواز میں الوداع کہنے کے لئے سٹیج پر آتے ہیں۔ محترم محمد اسلام صاحب نے اس کا بھی اعلان کر دیا اور پرویز صاحب بوجھل قدموں کے ساتھ سٹیج پر آ گئے۔

انہوں نے اپنی عمر کی طبعی رفتار کے پیشِ نظر فرمایا کہ زندگی کے متعلق یقینی طور پر کون کچھ کہہ سکتا ہے۔ اور آپ احباب جب جانے لگتے ہیں تو دل کچھ ملول سا ہو جاتا ہے کہ شاید اگلے سال مل سکیں گے یا نہیں ـــ! پرویز صاحب کے ان جملوں کو سنتے ہی احباب کی آنکھیں نمناک ہو گئیں اور اُن کی زندگی اور صحت کے لئے نہایت پُرسوز دعائیں فضا میں گونج گئیں۔

مفکرِ قرآن نے بتایا کہ یہ طلوعِ اسلام اب نہ میرا ہے، نہ یہ تحریک آپ احباب کی ہے ـــ بلکہ یہ وقت کی آواز بننے کو ہے۔ آپ احباب نے اگر ہمت اور استقلال سے کام لیا تو میرے موجود ہونے یا نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ یہ قرآنی دیا جلتا اور اندھیروں کے دامن کو چاک کرتا رہے گا۔ وبیدہ التوفیق۔

انہوں نے کہا کہ جب یہ آواز آپ کے دل کی آواز بن جائے گی تو میری موت اطمینان کی موت ہو گی۔ یہ

میرے لئے بڑی قیمتی متاع ہے۔ آپ یہ کچھ کرتے رہئے اور میں آئندہ سال تک آپ کی پیشانیوں سے دل کی تپش کو پڑھنے کا انتظار کرتا رہوں گا۔

انہوں نے کہا کہ یہ میری کمزوری ہے کہ دوستوں کو بچھڑتے ہوئے دیکھ کر میرا دل بے قابو سا ہو جاتا ہے۔ میں سال بھر اس کا منتظر رہوں گا کہ آپ آئینگے پھر یہی اہتمامِ ملاقات ہوگا۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

اس کے بعد آخری کھلے اجلاس کا اعلان کیا گیا۔

اتوار - ۲۵ر نومبر ۱۹۷۰ء - شام ۵½ بجے

چھٹا (آخری) کھلا اجلاس

صدارت ______ محترم سید عبدالودود صاحب
تلاوت ______ محترم حافظ محمد یونس صاحب
کلامِ اقبالؒ ______ محمد افضل صاحب
سٹیج سیکرٹری ______ محترم محمد اسلام صاحب

اس کھلے اجلاس میں محترم پرویز صاحب نے اپنا خطاب "اعمالنامہ" پیش کرنا تھا۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر سامعین نے جوق در جوق اس اجلاس میں شرکت کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پنڈال بھر گیا۔ محترم محمد اسلام صاحب نے تلاوتِ قرآن کریم کے لئے بزمِ لائل پور کے جواں ہمت رفیق محترم حافظ محمد یونس صاحب کا نام پکارا۔ تلاوت کے بعد بزمِ لائل پور کے رفیق جناب محمد افضل صاحب نے نہایت پرسوز انداز میں کلامِ اقبالؒ پیش کیا۔ اشعار تھے۔

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

آنسوؤں کی جھلمل میں محترم محمد اسلام صاحب کی پُرعزم آواز نے تحریکِ طلوعِ اسلام کا "اعمالنامہ" پیش کر دیا اور بتایا کہ کس طرح تحریکِ پاکستان میں طلوعِ اسلام نے اپنا کردار بہترین اور مؤثر انداز سے ادا کیا۔ اُن حالات میں یہ کام درحقیقت آگ سے کھیلنے کا تھا۔ اس کے بعد مفکرِ قرآن نے اپنے خطاب کا آغاز کیا جس کا عنوان تھا "اعمال نامہ"۔ اس خطاب میں قوم کی اجتماعی کوتاہیوں کی طرف نشاندہی کی گئی اور کئی ایک فاش غلطیوں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی تھی۔ اس اعتبار سے یہ خطاب تمام اہلِ فکر و نظر کے لئے سوچنے اور قرآن کو راہنما بنانے کی اہمیت پر ایک نہایت اہم دستاویز تھا۔

یہ مقالہ بھی طلوعِ اسلام کی اشاعتِ حاضرہ میں پیشِ قارئین ہو رہا ہے اس لئے اس بارے میں مزید کچھ نہیں

لکھا جا رہا۔ صدارتی خطاب میں ملک کے مایۂ ناز ڈاکٹر، مصنف اور فکرِ قرآنی کے پیامبر ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے نہایت جامع انداز سے پرویز صاحب کے خطاب کے مختلف گوشوں پر اظہارِ خیال فرمایا۔ اور کہا کہ اس 'تاریک دور میں' اور ان نامساعد حالات کے باوجود رسولِ اکرمؐ کے جھنڈے کو استقلال اور عزم سے تھامے رکھنا، جنابِ پرویز کے عظیم احسانات میں سے ایک ہے اور ساری قوم اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔ خدا کرے یہ دیا تادیر جلتا رہے اور قرآن کا نور ساری فضا میں پھیل جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے ان دعائیہ کلمات کے بعد جلسے کے ختم کرنے کا اعلان کیا گیا اور پھر احباب نے ایک دوسرے سے گلے مل کر ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ اس الوداعی منظر میں یہ مصرعہ بار بار فضا میں گونجتا رہا۔

دوستو صحبتِ احباب غنیمت سمجھو!

اس طرح کاروانِ قرآنی کا یہ سولہواں کنونشن نہایت حسن و خوبی سے اختتام پذیر ہو گیا۔ شرکاء کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ تحریکِ طلوعِ اسلام اب اس قدر ہمہ گیر ہو چکی ہے کہ مخالفت کی کوئی رکاوٹ اس کا راستہ نہیں روک سکتی، اور اہلِ پاکستان جو ہنگامی تحریکوں کی تباہیوں سے تنگ آ چکے ہیں اس تحریک کے سوا سلامتی کی راہ کوئی اور نہیں دیکھتے۔ شرکاء کا تاثر یہ تھا اور وابستگانِ تحریک اپنی گراں تر ذمہ داریوں کے احساس سے سرنگوں تھے۔ ذمہ داریوں کے احساس سے بھی اور بحضور رب العزت سجدۂ شکرانہ کے طور پر بھی۔

* * *

قراردادیں

قرارداد ۱ :- **قرارداد تعزیت** طلوعِ اسلام کے سالانہ کنونشن کا یہ اجلاس محترم میرزا محمد جمیل صاحب (مرحوم) کے سانحۂ رحلت کو تحریکِ قرآنی کا ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتا ہے اور بزمِ طلوعِ اسلام کراچی و دیگر بزمہائے طلوعِ اسلام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے اس سانحہ پر دلی رنج و ملال اور پسماندگانِ مرحوم خصوصاً ناظم ادارہ محترم مرزا محمد خلیل صاحب و محترم پرویز صاحب کے ساتھ دلی تعزیت کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

محرک :- محمد اسلام (نمائندہ بزم کراچی)

قرارداد ۲ طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن کا یہ اجلاس رفیقِ گرامی محترم شیخ حمید صاحب کو ہدیۂ تحسین پیش کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے کہ موصوف نے نہایت اخلاص، بے لوث اور مستقل مزاجی سے ادارہ طلوعِ اسلام کے شعبۂ اشاعت میں قابلِ قدر کارکردگی انجام دے کر ایک ایسی مثال قائم کی ہے جو اراکین بزمہائے طلوعِ اسلام کے لئے موجبِ رشک ہے۔ (محرک :- محمد اسلام۔ نمائندہ بزم کراچی)

قرارداد نمبر ۳ :- طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس محترم شیخ سراج الحق صاحب کا بخلوصِ قلب سپاس گزار ہے کہ موصوف نے کرم فرمائی سے کام لیتے ہوئے اپنے بنگلہ کا ایک حصہ مندوبین کنونشن کے قیام و طعام کے لئے کنونشن کمیٹی کی تحویل میں دے دیا اور اس طرح ان کے لئے قابلِ قدر سہولت فراہم کرکے کنونشن کو کامیاب بنانے میں معاونت فرمائی۔ (محرک، عبداللطیف نظامی۔ رکن بزم لاہور)

قرارداد نمبر ۴ :- طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ سالانہ اجلاس بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی کے ممتاز رکن ملک ظہور احمد صاحب کا بخلوصِ قلب شکرگزار ہے کہ انہوں نے مسلسل جانفشانی اور عرق ریزی سے مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کے ٹیپ پر ریکارڈ شدہ درسِ قرآن حکیم کو ضبطِ تحریر میں لانے کی مساعیٔ جمیلہ کو مستقل مزاجی سے ابتک جاری رکھا ہے۔ کنونشن کا یہ اجلاس موصوف سے بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ کارِ فیض کو آئندہ بھی جاری رکھیں گے (محرک۔ محمد اقبال سرور۔ رکن بزم ملتان)

قرارداد نمبر ۵ : تاریخ ہی کسی شخصیت یا تحریک کا بہترین سرمایہ ہوتی ہے اور اسے محفوظ کرنے والا قابلِ صد تحسین و آفرین۔ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی اور بالخصوص اس کے فعال و جواں سال نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب نے جس طور سال بسال سے تحریکِ طلوعِ اسلام کے ریکارڈ کو مرتب کرکے کنونشن کے سالانہ اجتماعات میں اپنے خصوصی سٹالز پر اسے کتبوں کی صورت میں EXHIBIT کرنے کی مبارک سعی جاری رکھی ہے وہ اپنے حسنِ معانی اور صورتِ جمیل میں اپنی مثال آپ ہے جس کے لئے جملہ مندوبین کنونشن انکے بصمیمِ قلب شکرگزار ہیں اور ان مساعیٔ جمیلہ کو بہ نظرِ استحسان دیکھتے ہیں۔ (محرک۔ مرزا محمد خلیل۔ ناظم ادارہ)

قرارداد نمبر ۶ :- طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن کا یہ اجلاس بزمِ طلوعِ اسلام لاہور، بزمِ طلوعِ اسلام ملتان اور بزمِ طلوعِ اسلام لائل پور کا شکرگزار ہے کہ انہوں نے باہمی تعاون اور یگانگت سے طلوعِ اسلام کنونشن کے انعقاد کے اخراجات مساوی حصہ میں برداشت کرکے اس کو کامیاب بنانے میں قابلِ قدر خدمت انجام دی۔

یہ اجلاس بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا خصوصی طور پر شکرگزار ہے کہ انہوں نے ملک کے طول و عرض سے آنے والے مندوبین کے قیام و طعام کے سلسلے میں موسمی شدائد کے باوجود ہرممکنہ سہولت فراہم کی۔

(محرک۔ محترم حسن عباس رضوی صاحب)

قرارداد نمبر ۷ :- طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس تمام شرکائے کنونشن اور خصوصی طور پر ان بزمہائے طلوعِ اسلام کے اراکین و معاونین کا شکرگزار ہے جو پنجاب کے حالیہ سیلاب سے متاثر ہونے کے باوجود ناساعد حالات میں بھی کنونشن میں حسبِ معمول شریک ہوئے اور اسے کامیاب بنانے میں ہرممکن تعاون کیا۔

(محرک۔ محترم مرزا محمد خلیل صاحب۔ ناظم ادارہ)

طلوعِ اسلام کنونشن کا مقالہ

محمد اکرم

تحریکِ طلوعِ اسلام کا

”عملنامہ“

(پرویز صاحب کے خطاب ”اعمال نامہ“ سے پہلے پیش کیا گیا)

صدرِ گرامی قدر و سامعین کرام!

محترم پرویز صاحب اپنے آج کے خطاب میں جو ”اعمال نامہ“ پیش فرمائیں گے وہ قوم کی چھبیس سالہ سرگزشت پر مشتمل ہوگا اس لئے عمیق بھی ہوگا اور طویل بھی۔ میں تمہیداً ایک مختصر سا ”اعمال نامہ“ پیش کرنا چاہتا ہوں جسے اس کے مختصر ہونے کی وجہ سے ’اعمال نامہ‘ کہنے کے بجائے ”عمل نامہ“ کہنا زیادہ موزوں ہوگا اور یہ عمل نامہ ہے تحریکِ طلوعِ اسلام کا، یا بالفاظِ صحیح خود پرویز صاحب کا عمل نامہ، کہ نہ تحریکِ طلوعِ اسلام کو پرویز صاحب سے الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ پرویز صاحب کو اس تحریک سے جدا۔ کون سی آنکھ پھول سے اس کی رنگت کو الگ کر سکتی ہے۔

یہ تو کم و بیش اہلِ پاکستان کو معلوم ہے کہ پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ نے عطا کیا تھا، لیکن اب شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو یا یاد رہا ہو کہ اس تصور کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ عام طور پر اِسے ’عام اصطلاح میں سیاسی یا معاشی تقاضا کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ درحقیقت تقاضا تھا دین کا، مطالبہ تھا اسلام کا۔ علامہ اقبالؒ نے دو نظریات پیش کئے تھے اور ان دونوں کو اسلامی نظام کے ستون کہا جاتا تھا۔ پہلا نظریہ یہ تھا کہ تمام مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں اور کوئی غیر مسلم اس قوم کا فرد بن نہیں سکتا خواہ وہ اُسی ملک کا باشندہ کیوں نہ ہو۔ اسے دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اپنی آزاد مملکت میں بن سکتا ہے یعنی اُس مملکت میں جس میں اسلامی احکام، قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ ہوں اور معاشرہ اقدارِ خداوندی کے قالب میں ڈھلا ہوا۔ یہ دونوں نظریئے بنیاد تھے مطالبۂ پاکستان کے۔ علامہ اقبالؒ نے اس کا تصور دیا اور قائد اعظمؒ اسے لے کر آگے بڑھے۔

ہندو کی طرف سے تو اس مطالبہ کی مخالفت ہونی ہی تھی کیونکہ وہ کبھی اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اس کے چنگل سے آزاد ہو کر اپنی خود مختار سلطنت قائم کر لیں، لیکن آسمان کی آنکھ یہ دیکھ کر محوِ حیرت تھی کہ خود مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کی طرف سے بھی اس مطالبہ کی مخالفت ہوئی اور شدید مخالفت! اس مخالفت میں بڑے بڑے اکابر علماء مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا حسین احمد مدنی۔

مفتی کفایت اللہ اور (ایک آدھ کو چھوڑ کر) تمام علماء دیوبند، علماء مجلس احرار، سرحد کے سرخپوش اور جماعتِ اسلامی سب پیش پیش تھے۔ یہ حضرات "اسلام" کے نام پر اس مطالبہ کی مخالفت کرتے تھے۔ اس وقت ملک میں کوئی ایسا جریدہ نہیں تھا جو دین کی بنیادوں پر ان کی مخالفت کا رد کرتا۔ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ۱۹۳۸ء میں طلوع اسلام وجود میں آیا۔ آپ اس زمانہ کے طلوع اسلام کے فائل اٹھا کر دیکھئے آپ کو نظر آجائے گا کہ یہ تنہا کس طرح انگریز، ہندو اور قومیت پرست مسلمانوں کے خلاف جو کھی لڑائی لڑ رہا تھا۔ اس نے ملک میں تہلکہ مچا دیا اور ہوا کا رُخ بدل دیا۔ اسلام کے یہ بڑے بڑے نام نہاد اکابرین سب بے دست و پا ہو کر رہ گئے۔ آج ہم اس کا رونا روتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے متعلق کوئی قابلِ اعتماد تاریخ نہیں لکھی گئی۔ ڈھونڈنے والے کو یہ تاریخ طلوع اسلام کے فائلوں میں ملے گی۔ طلوع اسلام کا یہ کارنامہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ تحیر افزا یہ حقیقت ہے کہ بانی تحریک طلوع اسلام جناب پرویز صاحب اُس زمانہ میں گورنمنٹ آف انڈیا میں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور ان کے معاونین بھی مختلف محکموں میں ملازم تھے۔ ان حضرات کی جرأتوں پر یقیناً حیرت ہوتی ہے کہ یہ گورنمنٹ کی ملازمت میں ہوتے ہوئے کس طرح آگ سے کھیل رہے تھے۔ ان کی یہی وہ جرأت ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے پیر علی محمد راشدی نے لکھا ہے کہ تحریکِ پاکستان کی تائید اور حمایت میں صرف تین سرکاری افسر میدان میں آئے۔ ان میں ایک پرویز صاحب تھے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت فروش یہ حقیقت ہے کہ پرویز صاحب نے اتنے وسیع میدان پر پھیلی ہوئی اس جنگ میں کسی سے کوئی مالی امداد نہیں لی بجز اپنے اُن دوستوں کے جو اُن کے ساتھ شریکِ محاذ تھے۔

پاکستان بن گیا تو ایک طرف قومیت پرستوں کا وہ تمام لشکر جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور جو پرویز صاحب کے ہاتھوں کے کھائے ہوئے زخموں کو چاٹ رہے تھے ہجوم کر کے پاکستان آگئے۔ یہاں پہنچ کر پرویز صاحب کے سامنے جنگ کا ایک نیا میدان کھل گیا۔ ان کے نزدیک جو کچھ حاصل ہوا تھا وہ صرف ایک خطۂ زمین تھا، اصل مقصد اس خطۂ زمین میں صحیح اسلامی مملکت کا قیام تھا۔ یہ تاریخ کا ایک عجیب المیہ ہے کہ جس مقصد کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا یہاں خود اُس مقصد کی مخالفت شروع ہو گئی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جن لوگوں نے تحریکِ پاکستان کی تائید کی تھی اُن میں اکثر و بیشتر وہ تھے جن کا مقصد صرف ایک آزاد مملکت کا حصول تھا نہ کہ اسلامی مملکت۔ اس مقصد کی اُن کی طرف سے بھی مخالفت ہوتی۔ اس کے علاوہ اس کی مخالفت قومیت پرستوں کے اس تمام لشکر کی طرف سے بھی شروع ہو گئی جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ وہ دراصل اپنی شکستِ پندار کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ اور اس سارے سیلابِ مخالفت کا مقابلہ پھر پرویز صاحب ہی کے مقدر میں لکھا تھا۔ یہاں پہنچنے پر جنوری ۱۹۴۸ء سے طلوع اسلام کا اجرا ہوا اور وہ آج تک مسلسل یکا و تنہا اس پورے محاذ کے سامنے مردانہ وار کھڑا ہے۔ جس طرح تحریکِ پاکستان کی تاریخ کا ملخص طلوع اسلام کے اُس دور کے فائلوں میں محفوظ ہے اسی طرح خود پاکستان کی تاریخ طلوع اسلام کے دورِ جدید کے پرچوں

ہیں مندرج۔

ہندوستان میں تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرنے والے لوگ قوم کے بیشتر حصے کی نگاہوں میں معتوب تھے اس لئے ان کا پروپیگنڈا کچھ زیادہ مؤثر نہیں ہوتا تھا۔ یہاں پہنچ کر ان کے پروپیگنڈہ نے بڑی وسعت اختیار کر لی۔ چونکہ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی کی اہم ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے اس لئے اس پراپیگنڈے میں انہوں نے ہر قسم کے جھوٹ، افترا، بہتان تراشی، تہمت سازی سے کام لیا۔ یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ شانِ رسالت ہے۔ تین نمازیں اور نو روزے بتاتا ہے۔ اردو میں نماز پڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔ کوئی نیا مذہب ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ نبوت کا دعوےٰ کرنا چاہتا ہے۔ غرضیکہ کوئی جھوٹا الزام نہ تھا جو ان کے خلاف عائد نہ کیا گیا ہو اور کوئی محراب و منبر نہ تھا جس سے مسلسل اور متواتر کذب و افترا کی یہ آوازیں سنائی نہ دیتی ہوں۔ پچیس سال سے یہ کچھ ہو رہا ہے۔ اور یہ پیرِ جواں ہمت تنہا اِن جھگڑوں کا مقابلہ کئے جا رہا ہے۔ صرف اپنے اُن چند ساتھیوں کے ساتھ جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ جس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اُسے اسلامی بنانا ناگزیر ہے۔ یہ افراد خود پرویز صاحب کی طرح، نہایت محدود وسائلِ معیشت رکھتے ہیں اس لئے یہ تحریک بھی محدود پیمانہ پر چلی آ رہی ہے۔ پرویز صاحب کے قائد اعظمؒ سے لے کر ان تمام حضرات تک سے، جو وقتاً فوقتاً صاحبِ اقتدار بنتے رہے، اچھے مراسم تھے لیکن انہوں نے ان میں سے کسی سے بھی اپنی ذات کے لئے کوئی مفاد حاصل نہیں کیا۔ نہ کوئی منصب مانگا۔ نہ اعزاز طلب کیا۔ نہ کوئی فیکٹری الاٹ کرائی نہ جاگیر حاصل کی۔ جس درویشی میں وہاں سے آئے اُسی درویشی میں اس وقت تک زندگی بسر کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ چراغ جنہیں انہوں نے اپنے خونِ جگر سے روشن کیا ہے، یعنی ان کی قلمی تخلیقات، وہ بھی اسی تحریک کے فروغ کا ذریعہ ہیں۔

پرویز صاحب نے اس قرآنی تحریک کو محض طلوعِ اسلام تک محدود نہیں رکھا۔ انہوں نے مختلف گوشوں اور زاویوں سے قرآنِ خالص پر اتنا کام کیا ہے، اور اس سلسلہ میں اتنا کچھ لکھا اور اتنا کچھ شائع کیا ہے کہ جہاں تک میری نگاہ میری رہبری کرتی ہے، ہماری اس ہزار سالہ تاریخ میں کسی ایک فرد نے قرآن خالص پر اتنا کام نہیں کیا۔ ان کی لغات القرآن جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کا مفہوم القرآن جو قرآن کریم کے تیس پاروں کو محیط ہے، اس کے ساتھ سلسلۂ معارف القرآن کی ضخیم مجلدات — من و یزداں۔ ابلیس و آدم۔ جوئے نور۔ برقِ طور۔ شعلۂ مستور۔ سیرتِ طیبہ پر معراجِ انسانیت۔ جہانِ فردا۔ کتاب التقدیر۔ اسلامی معاشرت، اسبابِ زوالِ امت، قرآنی قوانین و اقتدار۔ فکری تحقیق کے گوشے میں ان کی مایۂ ناز تصنیف "انسان نے کیا سوچا؟" اور اس کے جواب میں "اسلام کیا ہے"۔ اُن کے "سلیم اور طاہرہ کے نام خطوط" جو کئی جلدوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے مضامین کے شائع شدہ مجموعے فردوسِ گم گشتہ۔ سلسبیل۔ بہارِ نو۔ قرآن کے معاشی نظام کے متعلق "نظامِ ربوبیت" اور خدا اور سرمایہ دار۔ نیز ان کی زیرِ نگرانی ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع ہونے والی متعدد دیگر تصانیف اور اب ان کی وہ مایۂ ناز تصنیف جسے انہوں نے حالیہ کنونشن میں "شاہکارِ رسالت" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ آپ سوچیے کہ

ایک متنفس کی طرف سے قرآنی حقائق و معارف کے سلسلہ میں ایسا ضخیم، مستند، عمیق، وسیع لٹریچر کا ذخیرہ آپ کو کہیں اور ملتا ہے؟ فطرت نے انہیں قلم بھی بڑا سحر کار عطا فرمایا ہے۔ وہ اردو زبان کے صاحبِ طرز انشاء پرداز تسلیم کئے جاتے ہیں اور انگریزی زبان میں ان کی تصنیف "اسلام اے چیلنج ٹو ریلیجن" مغربی مفکرین تک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔

میں نے سامعینِ گرامی قدر! پرویز صاحب کی اس پینتیس سال پر پھیلی ہوئی جدوجہد اور ان کے تصنیفی کارناموں کی تفصیل، نہ تو اس لئے پیش کی ہے کہ مجھے صاحبِ تحریک کی مدح اور ستائش مقصود ہے، اور نہ ہی اس لئے کہ میں آپ سے تحریکِ طلوعِ اسلام سے داد طلب ہوں۔ میں نے یہ تذکرہ، آپ کی توجہ ایک اور حقیقت کی طرف مبذول کرانے کے لئے کیا ہے اور وہ یہ کہ آپ ملک کے مختلف اہلِ قلم کے مضامین میں، اور "اہلِ زبان" کے بیانات اور تقاریر میں اکثر تحریکِ پاکستان اور اس میں حصہ لینے والے حضرات کے تذکرے دیکھے ہوں گے۔ کیا آپ نے ان میں اس شخص کا نام بھی کبھی دیکھا ہے جس کی ساری زندگی اسی جدوجہد میں گزر چکی ہے؟ پھر آپ نے مختلف گوشوں میں ملک کے مشہور مصنفین کے نام بھی سنے اور دیکھے ہوں گے۔ کیا ان میں آپ کو اس شخص کا نام بھی نظر آتا ہے جس کی اس قدر عظیم تصانیف سارے ملک میں، اور بیرونِ ملک پھیلی ہوئی ہیں؟ کیا یہ چیز وجۂ تعجب اور باعثِ حیرت نہیں؟ — آپ کو معلوم ہے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ سبب یہ نہیں کہ یہ اہلِ قلم یا اہلِ بیان، پرویز صاحب کی جدوجہد اور ان کے تصنیفی کارناموں سے واقف نہیں۔ یہ سب جانتے ہیں لیکن — یہ مُلّا کے پروپیگنڈے سے اس درجہ خائف ہیں کہ پرویز صاحب کا نام زبان پر لاتے ہوئے سہم جاتے ہیں۔ لیکن پرویز صاحب نے اس کا کبھی احساس تک نہیں کیا۔ اور نہ میں نے اس کا تذکرہ اس لئے کیا ہے کہ مجھے ان حضرات سے کوئی شکایت ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں نہ ستائش کی تمنا اور نہ صلہ کی امید سے کرتے ہیں۔ ہم یہ سب کچھ اس یقین کے ساتھ کرتے ہیں کہ اگر ہم نے فی الواقع قرآن کی کوئی خدمت کی ہے تو زمانہ اسے ثبات و دوام عطا کر دے گا اور آنے والی نسلیں اس حقیقت میں اپنے لئے حیاتِ نو کے آثار پائیں گی کہ ہنگامہ خیزیوں اور مفاد پرستیوں کے اس دور میں بے سروسامان وارفتگانِ شوق کی ایک ایسی جماعت بھی تھی جو قرآن کی شمع روشن کئے ہوئے تھی۔

یہ ہے عزیزانِ من! ہمارا وہ "عمل نامہ" جسے میں نے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے — اس کے بعد آپ بچشمِ عبرت دیکھئے۔ اعمال نامہ — میرا اور اپنا اعمال نامہ۔

والسلام

* * *

ضروری اطلاع

ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور کے متعین کاروباری اوقات ۲ بجے بعد دوپہر سے ۸ بجے شام تک ہیں۔ ان اوقات کے سوا دفتر بند رہتا ہے۔ بذاتِ خود تشریف لانیوالے حضرات ان اوقات کا خیال رکھیں۔ (ناظم)

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

اعمال نامہ

وہ غلطیاں جنکی سزا ہم اس وقت بھگت رہے ہیں

پرویز صاحب کا خطاب

جسے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ نومبر ۱۹۷۳ء میں پیش کیا

سعید راقم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَعمالنامَہ

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت

کارگہِ کائنات کا تمام نظم و نسق، رہینِ منّت ہے سعی و عمل کا۔ اور یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ مساعی و اعمال صحیح نتائج بھی مرتب کر رہے ہیں یا نہیں، ان کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ اسی کو محاسبۂ نفس کہتے ہیں۔ جو راہرو یہ نہیں دیکھتا کہ اس نے کسقدر مسافت طے کر لی ہے اور باقی راستہ کتنا رہ گیا ہے، اسے منزل تک پہنچنے کی حتمی امید نہیں رکھنی چاہیئے، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی دوراہے پر وہ غلط موڑ مڑ گیا ہو، اور اس کے بعد وہ ہر چند چلا جا رہا ہو، لیکن اسے اس کا احساس تک نہ ہو کہ اس کا ہر قدم اسے منزل سے دور لئے جا رہا ہے۔ جو مریض ٹمپریچر کا چارٹ مرتب نہیں کرتا وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا علاج صحیح ہو رہا ہے یا نہیں۔

محاسبۂ خویش، انفرادی زندگی میں بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا، لیکن قوموں کی اجتماعی زندگی میں اس کی ضرورت لاینفک ہوتی ہے۔ عدمِ احتساب سے، انفرادی زندگی میں ایک فرد یا چند افراد کا نقصان ہوتا ہے لیکن اجتماعی زندگی میں اس سے چشم پوشی مملکتوں کو لے ڈوبتی ہے۔ ہم اس وقت جس دور سے گذر رہے ہیں اسے پاکستان کی تاریخ میں افسردہ ترین دور کہا جا رہا ہے۔ یہ اس لئے کہ اسوقت معاشرہ پر جس قسم کی ہمہ گیر، مہیب اور دبیز مایوسی کی گھٹائیں چھا رہی ہیں، اس سے پیشتر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ قوموں کو تباہ کرنے کے لئے ان میں مایوسی پھیلا دینا، ابلیس کا سب سے بڑا مؤثر حربہ ہوتا ہے۔ ابلیس کے معنی ہی مایوس ہیں۔ لیکن میں مایوس نہیں۔ جو قرآن کریم سے راہ نمائی حاصل کرے وہ کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس مایوسی کی تاریکیوں سے نکلنے کے لئے یہ دیکھنا نہایت ضروری ہے کہ ہم سے کیا کیا غلطیاں سرزد ہوئیں جن کی پاداش میں ہم اس عذاب میں گرفتار ہوئے ہیں۔ ہم سے کس کس قسم کے جرائم کا ارتکاب ہوا جس کا نتیجہ یہ عالمگیر مایوسی ہے۔ یہ اس لئے کہ قوموں کا ضعف، انتشار، یا زوال کسی ہنگامی حادثہ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے ان کی پوری اجتماعی زندگی کی تساہل انگاریوں، غلط کوشیوں، غفلت شعاریوں اور مجرمانہ غدّاریوں کے اجتماعی تاثرات (ACCUMULATIVE EFFECT) کا۔ آج کی نشست میں ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ پاکستان کی اس چھبیس سالہ زندگی میں ہم سے وہ کونسے کبائر الاثم

سنگین جرائم سرزد ہوئے ہیں جن کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ جب اس طرح مرض کی تشخیص ہو جائیگی تو پھر اس کا علاج آسان ہو جائیگا۔

واضح رہے کہ ہمارے اس احتساب، یا تنقید کا ہدف نہ کوئی خاص فرد ہے، نہ کسی خاص دور کی حکومت ان کوتاہیوں اور غلطیوں کی ذمہ داری پوری کی پوری قوم پر عائد ہوتی ہے، اس لئے یہ محاسبہ خود اپنی ذات کا محاسبہ ہے، اور یہ تنقید خود اپنے آپ پر تنقید۔ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس چھبیس سالہ تاریخ میں قائداعظمؒ کی ذات ملوث نہیں کیونکہ تشکیل پاکستان کے بعد انہیں چند دنوں کی زندگی نصیب ہوئی اور وہ بھی اسقدر پریشانیوں میں گھری ہوئی کہ انہیں مملکت کے اہم معاملات پر سکون و اطمینان سے غور کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ خود ان کی زندگی بھی انہی پریشانیوں کی نذر ہو گئی۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ تشکیل پاکستان کے بعد، ہم سے کیا کیا بڑی غلطیاں سرزد ہوئیں۔

باؤنڈری کمیشن

تقسیم ہند کا اصول تو پُرسکون فضا میں طے پا گیا تھا لیکن اُس کے عملی نفاذ کیلئے انگریز اور ہندو کی ملی بھگت نے اسقدر افراتفری اور کھڑکھڑاہٹ پیدا کر دی تھی کہ اُس کی جزئیات پر غور و فکر کا موقع ہی نہ دیا گیا۔ اس افراتفری کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ مملکت پاکستان بلا تعین حدود وجود میں آگئی۔ سیاسی لغت میں مملکت کی تعریف (DEFINITION) کی اوّلین سطر یہ ہے کہ وہ ایک متعین رقبہ کے اندر قائم ہو۔ آئینی تاریخ میں شاید یہ پہلی مثال ہو کہ ایک مملکت تو وجود میں آ جائے لیکن اس کے رقبہ کی حدود متعین نہ ہوں۔ ہندوستان اور پاکستان کی حدود کے تعین کیلئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا جس نے اپنے فیصلے کا اعلان تقسیم ہند کے بعد کیا۔ اصول یہ تھا کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلم اکثریت کے علاقے، مملکت پاکستان کے حصے قرار پائیں گے۔ لیکن کمیشن کے فیصلہ کی رُو سے پنجاب اور بنگال کو اسطرح تقسیم کر دیا گیا کہ ان کے نہایت اہم اور کلیدی رقبے ہندوستان کو دے دیئے گئے۔ یہ فیصلہ سراسر دھاندلی پر مبنی تھا، لیکن اس کا اعلان ایسے حالات میں کیا گیا جن میں پاکستان خاموش رہنے کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ قلبِ پاکستان کے لئے یہ زخم کتنا گہرا تھا اس کا اندازہ قائداعظمؒ کی اُس تقریر سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ریڈیو لاہور سے نشر کی۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:

> ملک کی تقسیم اب اس انداز سے اختتام پذیر ہو گئی ہے کہ اسے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں اس کا گہرا احساس ہے کہ ہماری آزاد مملکت کے جس طرح پرخچے اڑائے گئے ہیں وہ یکسر ناانصافی پر مبنی ہیں۔ ہمیں پہلے ہی آخری حد تک سمٹا دیا گیا تھا۔ اور پھر رہی سہی کسر باؤنڈری کمیشن نے پوری کر دی۔ کمیشن کا فیصلہ غیر منصفانہ، ناقابلِ فہم اور بدنہادی پر مبنی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم نے اس کی پابندی کا عہد کر لیا ہوا ہے لہٰذا اس کا قبول کرنا ہم پر واجب ہو گیا ہے۔ ہم ایفائے عہد کرنے والے شریف لوگ ہیں۔ اس

> لئے ہمیں خواہی نخواہی اسے قبول کرنا ہو گا۔ یہ ہماری بدنصیبی سہی، لیکن جہاں ہم نے اتنی چوٹیں پہلے برداشت کی ہیں، اسے بھی ہمت، حوصلہ اور امید کے ساتھ برداشت کر لینا چاہیئے۔

ممالک کی وہ مشکلات کیا تھیں جن کے تابع ہم نے اس کمیشن کا تقرر اور اس کے فیصلے کی پابندی قبول کر لی تھی، اسکی تفصیل ہمارے سامنے نہیں آئی۔ اس زمانے کے وزیر اعظم پاکستان نے، اپنی ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کی نشری تقریر میں، اتنا کہا تھا کہ:

> عام طور پر پوچھا جاتا ہے کہ مسلم لیگ نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کیوں قبول کی جب وہ جانتی تھی کہ اس کے کیا نتائج نکلنے والے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم سے یہ کہا گیا تھا کہ اگر ہم نے صوبائی تقسیم قبول نہ کی تو ہمیں پاکستان نہیں ملے گا۔ اگر ہم موجودہ پاکستان قبول نہ کرتے تو اس کے نتائج اتنے خطرناک ہوتے کہ مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ (طلوع اسلام ستمبر ۱۹۴۸ء)

یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے اس یکسر دھاندلی پر مبنی تقسیم کو بامر مجبوری قبول کر لیا، لیکن ہمیں چاہیئے تھا کہ ہم اسکے خلاف مسلسل صدائے احتجاج بلند کرتے رہتے۔ اپنی قوم کو ذہنی طور پر اس کے لئے آمادہ کرتے کہ جب بھی ممکن ہو وہ اس ظالمانہ فیصلے کو بدلوائیں؛ اور ضمیر عالم میں بھی اس دھڑکن کو بیدار رکھتے کہ انگریز اور ہندو نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔ ظلم کو خاموشی سے برداشت کر لینا ظالم کی حوصلہ افزائی کا موجب ہوتا ہے جو اس کے دل میں مزید مظالم کی جرأتیں پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ہم سے پہلی غلطی ہوئی جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگتتے چلے آ رہے ہیں۔

(٠)

ہندی مسلمان

تحریک پاکستان کے دوران اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے جس ہمت، حوصلہ اور ایثار کا ثبوت دیا اسکی مثال نہیں مل سکتی۔ اکثر کہا جاتا تھا (اور ہندو اور نیشنلسٹ مسلمان اس احساس کو شدید تر کرنے کے لئے مسلسل پراپیگنڈہ کرتے رہتے تھے) کہ تقسیم ہند سے اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کی تو اپنی آزاد مملکت قائم ہو جائے گی، اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو اس سے کیا ملے گا؟ اقلیتی صوبوں کے مسلمان نہایت سکون اور استقامت سے اس کا جواب دیتے کہ ہمارے لئے یہ صلہ ہی کچھ کم نہیں کہ ہمارے بھائیوں کو صحیح آزادی نصیب ہو جائے گی۔ تقسیم کے وقت یہ اصول بھی طے پایا تھا اور ہندوؤں نے بار بار اس کی یقین دہانی کرائی تھی کہ اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا۔ اس باب میں کسی کو کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن اس معاہدہ کی ہنوز روشنائی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ ہندوؤں نے اس کی خلاف ورزی شروع کر دی اور ہندوستان کے مسلمانوں سے برملا کہنا شروع کر دیا کہ انہیں وہاں ہندو بن کر رہنا پڑے گا (مثلاً) ہندوستان کے پہلے جشن آزادی کی تقریب پر یو۔ پی۔ کانگریس کمیٹی کے صدر اور وہاں کی اسمبلی کے سپیکر مسٹر ٹنڈن نے پورے جوش و خروش کے ساتھ کہا کہ:

> ہندوستان یونین میں جداگانہ زبان اور جداگانہ کلچر کی آواز کہیں سے نہیں نکلنی چاہیئے، جو لوگ کسی خاص فرقے کے لئے جداگانہ زبان یا کلچر کی حمایت کرتے ہوں ان کے لئے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنا نظریہ نہ بدل سکے تو انہیں ہندوستان چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا چاہیئے۔ اگر مسلمان ہندوستان میں رہنے کے خواہش مند ہیں تو انہیں ہندی کو بطور زبان اور ناگری کو بطور رسم الخط اختیار کرنا ہوگا۔ انہیں اپنی تہذیب اور تمدن کے لئے عرب یا پاکستان کیطرف نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ بھارت ورش کے کلچر کو اپنا کلچر بنانا چاہیئے۔
>
> (ہندوستان ٹائمز ۴۸-۸-۱۶)

سی۔ پی کے وزیر اعظم مسٹر شکلا نے بھی اس کا اعادہ کیا اور کہا:

> میں ان مسلمانوں کو جن کے دماغ میں ابھی تک مسلم لیگی ذہنیت موجود ہے، یہ چیلنج دینا چاہتا ہوں کہ آج ایک زبان اور ایک تہذیب کے خلاف جو کوششیں ہو رہی ہیں انہیں نہ تو ہم برداشت کریں گے اور نہ ہی کامیاب ہونے دیں گے۔ (ملاپ مورخہ ۱۲/۱۲/۴۸)

اور انڈین پارلیمنٹ کے سپیکر مسٹر مولنکر نے کہا کہ:

> اب اقلیت کے فرقے کو اس امر کا احساس کرنا چاہیئے کہ وہ ایک بڑے خاندان کا ممبر ہے اور اُسے اس بڑے خاندان میں اپنی ہستی کو ضم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔
>
> (طلوع اسلام۔ فروری سنہ ۱۹۴۹ء)

راشٹریہ سیوک سنگھ، ہندوستان میں ہندوؤں کی ایک بڑی مؤثر جماعت ہے اس جماعت کے سربراہ نے "ہماری قومیت کی تاریخ" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ "ہندوستان میں، قوم سے مطلب صرف ہندو قوم ہے۔ وہ تمام لوگ جو ہندو قوم، ہندو مذہب، ہندو کلچر اور ہندو زبان سے تعلق نہیں رکھتے وہ قومی زندگی سے قدرتی طور پر باہر ہیں۔ غیر ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ لباس، رسم و رواج، شادی بیاہ، تجہیز و تکفین، یہاں تک کہ مکانات کی تعمیر میں بھی ہندوؤں کے طریقے اختیار کریں"۔ (طلوع اسلام فروری سنہ ۱۹۴۶ء)۔ راشٹریہ سیوک سنگھ یا ہندو مہاسبھا کے متعلق کہا جاسکتا تھا کہ وہ متشدد، متعصب جماعتیں ہیں اسلیئے وہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کی مخالفت کا تعلق ہے وہاں متعصب اور غیر متعصب ہندو میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سوشلسٹ پارٹی کو غیر متعصب ہی نہیں کہا جاتا۔ ان کے متعلق... سمجھا یہ جاتا ہے کہ وہ کسی مذہب کے بھی پیرو نہیں ہوتے؛ اس پارٹی کے لیڈر، ڈاکٹر لوہیا نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ

> اگر مجھے طاقت حاصل ہو گئی تو میں مسلم پرسنل لاء کو بدلے بغیر کیسے رہ سکوں گا۔ ایک اخبار نویس کے اس اعتراض پر کہ آئین میں یہ ضمانت بھی تو دی گئی ہے کہ کسی کے مذہب میں دخل نہیں دیا جائے گا، ڈاکٹر لوہیا نے کہا کہ یہ مذہب کی بات نہیں۔ آئین میں مذہب میں دخل اندازی نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اس کے طریقہ عبادت سے نہ روکا جائے۔

> عبادت گاہوں کے تحفظ میں تو کوتاہی نہیں کی جائے گی لیکن ایک مملکت میں الگ الگ قوانین کی اجازت نہیں دی جا سکتی خواہ وہ قوانین پرسنل لاز ہی کیوں نہ ہوں۔
> (طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۶۶ء)

اور یہ خیالات ہندوؤں تک ہی محدود نہیں تھے۔ وہاں کے مسلمان نیشنلسٹ بھی اس باب میں اُن سے پیچھے نہیں تھے۔ ۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ واشنگٹن میں اسلامک سٹڈیز کا ایک کلوکیم منعقد ہوا جس میں ہندوستان کی نمائندگی مسٹر آصف فیضی نے کی۔ انہوں نے اس مذاکرہ میں ایک مبسوط مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا "ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظرثانی کی ضرورت"۔ اس میں انہوں نے ہندی مسلمانوں کے سلسلے میں کہا کہ:

> راقم الحروف کو پورا یقین ہے کہ ایسے تمام انفرادی اور شخصی قوانین جو کسی قوم کی سماجی زندگی کے متعلق قدیم اصولوں پر مبنی ہیں رفتہ رفتہ یا تو منسوخ ہو جائیں گے اور یا ان میں اتنی تبدیلی ہو جائے گی کہ وہ قوانین کی ایک ایسی عام اسکیم کے تحت ہو جائیں جو ہر شخص پر بلا لحاظ مذہبی اختلاف یکساں طور پر عائد ہو سکیں۔ (طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۵۶ء)

اس قسم کے مسلسل پراپیگنڈہ سے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا جذبۂ نفرت، بغض اور عداوت کس قدر شدید ہوتا چلا گیا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہاں کئی مقامات پر مسلمانوں کو اپنے قبرستانوں میں بھی اپنی میتیں دفن کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ بعض جگہ دفن شدہ لاشوں کو نکال کر پھینک دیا جاتا تھا۔ مسجدوں پر زبردستی قبضہ کر لیا جاتا تھا۔ یہ واقعات اس قدر شدت اختیار کر گئے کہ ان سے متاثر ہو کر وہاں کے ایک ہندو مذہبی رہنما ...... اکشے برہم چاری ... نے تنگ آ کر مرن برت رکھ لیا تاکہ وہ اس طرح حکومت کے ضمیر کو جھنجھوڑ سکے۔ لیکن کانگریسی حکومت کے ضمیر پر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ (طلوعِ اسلام اکتوبر ۱۹۵۰ء)

ہمارے ہاں کے سوشلزم زدہ نوجوان اکثر کہا کرتے ہیں کہ "مذہب، کلچر، تمدن وغیرہ فرسودہ تصورات ہیں، لہٰذا ان کا مٹ جانا ہی بہتر ہے۔ اصل سوال روٹی کا ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ تقسیم ہند سے حاصل کیا ہوا؟ اس سے ہم نے خواہ مخواہ مصیبتیں مول لے لیں۔ روٹی کا مسئلہ متحدہ ہندوستان میں اس سے بھی بہتر طریق پر حل ہو سکتا تھا۔" اگر اصل مسئلہ روٹی ہی کا ہے تو ہم اپنے ان سادہ لوح نوجوانوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ اس باب میں بھی ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔ جمعیت العلمائے ہند وہاں کے قومیت پرست مسلمانوں کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت ہے۔ انہوں نے تحریک پاکستان کی شدید ترین مخالفت کی تھی۔ اس جماعت کے ترجمان "الجمعیت" نے مئی ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا:

> ہم وزیر داخلہ پنڈت پنت کو یقین دلاتے ہیں کہ ہندوستان کی مسلم اقلیت یہاں بے حد پریشان ہے۔ جب وہ سوچتی ہے کہ اس ملک میں آنے والی نسلوں کا کیا بنے گا تو وہ سخت

> مضطرب و غمگین ہو جاتی ہے۔ حالت یہاں یہ ہو چکی ہے کہ ایک مسلمان نوجوان خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو تلاش روزگار میں مارے مارے پھرتا ہے اور جب اُسے پیٹ بھرنے کی کوئی سبیل دکھائی نہیں دیتی تو بے چارہ مجبور ہو کر پاکستان کا رخ کر لیتا ہے۔ اس کے سوا وہ اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ (طلوع اسلام جون ۱۹۵۸ء)

یہ ۱۹۵۸ء کی بات تھی اب ۱۹۷۳ء کی حالت بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔ بھارت کے کہنہ مشق صحافی مسٹر ملہوترا نے اپنے ایک مبسوط مقالہ میں کہا ہے کہ بھارت میں مسلمان اقلیت کے خلاف تعصب اور ظلم و تشدد کی انتہا کر دی گئی ہے۔ ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہیں اور دفاع اور قومی سلامتی کے تمام محکموں سے اکثر مسلمانوں کو نکال دیا گیا ہے اور باقی نکالے جا رہے ہیں۔ (طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۷۳ء)

بھارت کا ہندو اسی پر اکتفا نہیں کر رہا کہ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو ختم کر دیا جائے یا ان پر معاش کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ یا تو مسلمان شدھ ہو کر اپنے آپ کو ہندو قومیت میں جذب کر لیں اور جو ایسا نہ کریں اور مسلمان رہنے پر مُصر ہوں ان کا صفایا کر دیا جائے۔ اس کا طریق کار وہ ہے جسے "ہندو مسلم فسادات" کا نام دے کر مشہور کیا جاتا ہے لیکن جو درحقیقت مسلمانوں کی نسل کُشی کے لئے ایک منظم پروگرام ہے۔ تقسیم ہند کے بعد وہاں جس قدر فسادات ہوئے ہیں میں نے ان کی تفصیل اپنے اُس مقالہ میں درج کی تھی جس کا عنوان تھا۔ ہند کیا ہے۔ وہ مقالہ طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۷۱ء میں چھپا تھا اور بعد میں پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا گیا تھا۔ اس مقام پر میں اُن تفصیلات کو دہرانا ضروری نہیں سمجھتا، صرف اتنا بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ خود ہندوؤں کے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق وہاں تقسیم ہند کے بعد ۱۹۶۸ء تک کم از کم پانچ سو فسادات برپا کئے گئے، جن میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ اس کے بعد فسادات کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی اور مسٹر ملہوترا کے اس بیان کے مطابق جس کا میں نے اوپر حوالہ دیا ہے، یہ فسادات خود حکومت کی سرپرستی میں کرائے کے لوگوں سے کرائے جاتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں کوئی مسلمان بھی اپنی جان، مال، عزت آبرو کو محفوظ نہیں پاتا۔

میں نے یہ تفصیلات اس لئے پیش نہیں کیں کہ آپ کو بتایا جائے کہ ہندو کی ذہنیت کیا ہے۔ اس کا ذکر تو ذرا آگے چل کر آئے گا۔ ان تفصیلات کے پیش کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ اس باب میں ہم سے کیا غلطی ہوئی۔ ہندی مسلمانوں کے مستقبل کا احساس قائداعظمؒ کے دل میں پہلے دن سے بیدار تھا۔ چنانچہ انہوں نے تشکیل پاکستان کے چار ہی دن بعد، قوم کے نام، عید کے پیغام کے دوران فرمایا:

> ہمارے ان مسلمان بھائیوں کو جو ہندوستان میں اقلیت ہیں، یقین رکھنا چاہیئے کہ ہم انہیں نہ کبھی فراموش کریں گے نہ نظرانداز۔ ہمارے دل ان کے ساتھ ہیں اور ہم ان کی امداد اور بہبود کے سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ برصغیر میں یہ اقلیتی صوبوں کے مسلمان ہی تھے جو تحریک پاکستان کے السابقون الاولون اور اس رزمگاہ میں اس کے علمبردار تھے۔ مجھے اُمید ہے کہ پاکستان

کے مسلمان اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔

سوال یہ ہے کہ ہم وہاں کے مسلمانوں کی حفاظت اور بہبود کے لئے کیا کر سکتے تھے؟ اس کا ایک اور صرف ایک طریقہ تھا اور وہ تھا تبادلۂ آبادی۔ تقسیم ہند کے عواقب میں مسلمانوں کا جو قتلِ عام ہوا اس سے متاثر ہو کر خود قائداعظمؒ کے پیشِ نظر بھی اس مسئلہ کا یہی حل تھا، چنانچہ انہوں نے (۱۱) اکتوبر ۱۹۴۷ء کو 'خالقدینا ہال' کراچی میں پاکستان آفیسرز سے خطاب کرتے ہوئے 'ان ظالمانہ خون ریزیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ:

> اگر اقلیتوں کے مسئلے کا آخری حل پوری کی پوری آبادی کا تبادلہ ہے تو اس کا فیصلہ حکومتی سطح پر کر لینا چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ قائداعظمؒ کے تصور میں پہلے دن سے ایک ایسا پاکستان تھا جو ہندوستان کی تمام مسلم آبادی پر مشتمل ہو۔ انہوں نے ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی برطانوی شاخ کے اجلاس منعقدہ لندن میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں سمجھ نہیں سکا کہ ہندو' بالآخر پاکستان سے گھبراتے کیوں ہیں۔

> ان کی مملکت میں خالص ہندوؤں کی آبادی بیس کروڑ ہو گی اور پاکستان میں مسلمانوں کی آبادی ان سے نصف یعنی قریب دس کروڑ۔ (تقاریر قائداعظمؒ۔ جلد دوم)

قومیت پرست مسلمانوں کا طرزِ عمل

اس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی کل آبادی دس کروڑ کے لگ بھگ تھی اور قائداعظمؒ کے ذہن میں یہی نقشہ تھا کہ وہ پوری آبادی منتقل ہو کر مسلمانوں کی جداگانہ مملکت میں آ جائے گی۔ لیکن جن حالات میں پاکستان وجود میں آیا ان میں انتقالِ آبادی تو ایک طرف خود اکثریت کے پورے پورے صوبے بھی ہمیں نہ مل سکے اور تقسیم کے بعد قائداعظمؒ کو اتنی مہلت نہ مل سکی کہ وہ اس مسئلہ کو اٹھاتے۔ طلوعِ اسلام اس سوال کو اچھالتا رہا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اس چھبیس سال کے عرصے میں کسی حکومت نے بھی اس نازک ترین اور اہم ترین سوال کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اس مقام پر میں آپ حضرات کے سامنے ایک بڑی دلچسپ لیکن اس کے ساتھ ہی عبرت انگیز حقیقت لانا چاہتا ہوں۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کا عقیدہ یہ تھا کہ قومیت کا معیار' وطن کا اشتراک ہے۔ ان کے اس عقیدہ کی رو سے' تقسیمِ ہند کے بعد' ہندوستانی مسلمان اور پاکستانی مسلمان دو الگ الگ قومیں قرار پا گئے۔ اس بنا پر مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے جمعیت العلماء ہند کے اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۴۸ء میں' اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ:

> تقسیم ہند کے ساتھ ہی مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ پاکستان کے مفاد تقسیم ہو گئے ہیں۔ ہمارا فریضہ اب یہی ہے کہ ہم مسلمانانِ ہند کے مفاد کا تحفظ کریں نہ کہ اُن مسلمانوں کے مفاد کا جو سرحدِ ہند کے اس پار پاکستان میں بستے ہیں۔ اگر کبھی ہندوستان اور پاکستان میں شدید قسم کے اختلافات رونما ہو گئے تو ہمارا مسلک ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کی روشنی میں متعین ہو گا۔ (طلوع اسلام۔ جون ۱۹۴۸ء)

ضمناً، مولانا مدنی (مرحوم) نے یہ کچھ اپریل ۱۹۴۸ء میں فرمایا تھا۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں اسی جمعیت کے اجلاس

(منعقدہ لاہور) کی صدارت انہی شیخ الحدیث نے فرمائی تھی جس میں ایک ریزولیشن یہ بھی پاس کیا گیا تھا کہ، جمعیت، عراق، شام، فلسطین، ایران وغیرہ اسلامی ممالک پر کسی غیر مسلم قوت کا غلبہ و استیلا کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ اس ریزولیشن کی تائید میں، جمعیت کے سکرٹری مولانا احمد سعید (مرحوم) نے فرمایا تھا کہ

> تمام دنیا کے مسلمان اسلامی اخوت کے رشتہ میں منسلک ہیں۔

اس سے بھی پیچھے چلے جائیے اور نیشنلسٹ علماء کے سرخیل، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے ارشادات خود سنیئے جو وہ اپنے قومیت پرستی کے زمانے سے پہلے ارزانی فرمایا کرتے تھے۔ دیکھئے وہ کسطرح گرجتے، کڑکتے، ٹھیٹھ ابوالکلامی انداز میں فرماتے ہیں۔

> پس اے عزیزانِ ملت اور اے بقیۂ ماتم زدگانِ قافلۂ اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر ہم اس کا زخم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیروِ توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک ماننے والے وطن کے حلقِ بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرے۔ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی پر لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعتِ نزع میں اَشْهَدُ اَن لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو اگر ہم اپنی گردنوں میں اس کے تشنج محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدان میں حافظین کلمہ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھلنی ہو رہے ہیں، تو ہم اللہ، اس کے ملائکہ اور اس کے رسول کے آگے ملعون ہوں اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ حالانکہ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے تو مجھ کو کہنا چاہیئے کہ اگر میدانِ جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ ہندوستان کا کوئی مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے، کیونکہ ملتِ اسلام ایک جسدِ واحد ہے اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضاء جوارح۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضا کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں ممکن نہیں کہ اس کے صدمے سے بے خبر ہوں۔
>
> (الہلال۔ بابت ۱۶ر نومبر ۱۹۱۲ء)

یہ ہمارے علماء کا دورِ قومیت پرستی سے پہلے کا اسلام تھا۔ اس کے بعد ان کے اسلام کی تعلیم یہ تھی کہ "تقسیم ہند کے ساتھ ہی مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ پاکستان کے مفاد تقسیم ہو گئے ہیں"۔ لیکن یہ تفریق اور تقسیم مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ پاکستان کے درمیان نہیں تھی بلکہ پاکستان کے حامیوں اور قومیت پرست مسلمانوں کے درمیان تھی۔ ہندوستان کے قومیت پرست علماء کی ہمدردیاں پاکستان کے قومیت پرست مسلمانوں کے ساتھ بدستور قائم تھیں۔ چنانچہ وہی مولانا مدنی جنہوں نے اپریل ۱۹۴۸ء میں فرمایا تھا کہ اب مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ پاکستان کے مفاد الگ الگ ہو گئے

ہیں جب اسی سال اکتوبر میں ان تک یہ (غلط یا صحیح) اخباری رپورٹیں پہنچیں کہ سرحد میں قومیت پرست مسلمانوں کو ستایا جا رہا ہے، تو وہ تڑپ اٹھے اور سینے کے پورے زور کے ساتھ اعلان فرمایا کہ:

> صوبہ سرحد میں خدائی خدمتگاروں پر نت نئے مظالم کی جو اطلاعات ہم تک پہنچ رہی ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو قیوم۔ وزارت کا طرزِ عمل قابلِ افسوس اور مذموم ہے۔ سرخپوش قوم کے سچے خادم ہیں۔ انہوں نے جنگ آزادی میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیا ہے۔ حکومت سرحد کی اسلام کے جعلی نام پر ان فسطائی اطوار کو قوم برداشت نہیں کرے گی۔ (طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

آپ نے غور فرمایا کہ ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے مفاد الگ الگ ہو چکے ہیں اور دوسری طرف، پاکستان کے قومیت پرست مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کا جذبہ کس قدر جوش مار رہا ہے! یعنی ان حضرات کے نزدیک باہمی اخوت اور ہمدردی کا معیار مسلمان ہونا نہیں رہا تھا۔ نظریۂ قومیت قرار پا گیا تھا اور وہ اس قدر شدت اختیار کر گیا تھا کہ اگر تحریکِ پاکستان کے حامی مسلمانوں پر کوئی آفت آئے، تو ہندوستان کے مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، لیکن اگر پاکستان کے نیشنلسٹ مسلمانوں پر مبیّنہ مظالم ہوں تو ہندوستان کا وطنیت پرست مسلمان اس سے تڑپ اٹھے۔ آپ نے غور فرمایا کہ نیشنلزم، انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے؟ وہ ایک نیا مذہب بن جاتی ہے جو اسلام کی جگہ لے لیتی ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں پر ہندوؤں کیطرف سے جو مظالم ہو رہے تھے، وہ کس جرم کی پاداش میں تھے۔ اسے بھی غور سے سنیئے۔ اُس زمانے میں، دہلی میں ایک ممتاز ہندو راہنما۔ پنڈت سندر لال جی ہوا کرتے تھے جو اپنے آپ کو فخر سے مسلمان کہا کرتے تھے۔ انہوں نے دسمبر ۱۹۴۸ء میں جامع مسجدِ دہلی، میں مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

> اگر ان کے ساتھ کسی قسم کی سختی ہوتی ہے تو انہیں اس سختی کو ان لوگوں کی طرف سے کفارہ سمجھ کر برداشت کر لینا چاہیئے جنہوں نے پاکستان بنوایا تھا۔ آخر تمہیں میں سے وہ لوگ تھے جو "لے کے رہیں گے پاکستان" اور "بٹ کے رہیگا ہندوستان" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ (صدق، لکھنؤ ۔ ۱۷/۱۲/۴۸)

یہ تھی ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی حالت تقسیم کے فوری بعد؟ وہ رہ رہ کر پاکستانی مسلمانوں کیطرف تکتے تھے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہاں سے انہیں کیا جواب ملتا تھا؟ اس جواب کی ساری تفصیل اس "فتویٰ" کے چار لفظوں میں سمٹ آئے گی جو جون ۱۹۵۱ء میں یہاں سے صادر ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ (اخوت اور یگانگت کے تعلقات تو ایک طرف)

> ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ کا رشتہ نہیں ہونا چاہیئے۔
> (ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۵۱ء ۔ صہ ۶)

آپ کو معلوم ہے کہ یہ فتویٰ کن صاحب کی طرف سے شائع ہوا تھا؟ جماعتِ اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کیطرف سے، جن کا دعوےٰ ہے کہ یہ نظریہ سب سے پہلے انہی نے پیش کیا تھا کہ اسلام میں قومیت کا معیار، مذہب کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا اشتراک۔ وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دینے والے، مولانا مدنی کی تو یہ کیفیت کہ وہ الگ الگ وطنوں کے باوجود، اپنے ہم مسلک پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ اس قدر گہرے روابط کے

حامی تھے اور اشتراکِ مذہب کو معیارِ قومیت قرار دینے کے مدعی، مودودی صاحب کا یہ عالم کہ وہ ہندی اور پاکستانی مسلمانوں میں ازدواجی رشتہ تک کی ممانعت فرماتے ہیں!

یہ تھا وہ جواب جو ہماری طرف سے ہندوستانی مسلمانوں کو مل رہا تھا (اور آج تک مل رہا ہے)۔ ہم نے ہندی مسلمانوں کو کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ دیا اور یہ ہے وہ جرم جس کی سزا ہم اس بری طرح بھگت رہے ہیں کہ اب دنیا میں خود ہم سے زیادہ کسمپرس کوئی نہیں۔ ہمیں چاہیئے یہ تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کو ادھر منتقل کرنے کا سوال مسلسل اٹھاتے رہتے اور اس کے لئے اعداد و شمار کی بنیادوں پر مزید رقبہ حاصل کرتے۔ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم نے اپنے سامنے اتنا ہی نصب العین رکھا کہ ہم اپنی سرحدوں کی حفاظت کرتے رہیں۔ ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ہم ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلمانوں کو ادھر منتقل کرنے کی اسکیم اپنے سامنے رکھتے اور اس کے لئے ہندوؤں سے رقبہ حاصل کرتے۔ اس سے نہ صرف وہاں کے مسلمانوں کا تحفظ ہو جاتا ہے بلکہ خود مملکتِ پاکستان بھی بڑی مستحکم ہو جاتی۔ ہم نے ہندی مسلمانوں کے ساتھ یہ بے رخی برتی ہے لیکن وہ اب بھی ہم سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ ہم انہیں اپنے آغوشِ حفاظت میں لے لینگے۔ حال ہی میں، ہندوستان سے آنے والے ایک غیر متعارف دوست کی طرف سے مجھے وہاں سے شائع ہونے والا ایک ماہنامہ موصول ہوا ہے جس کا نام ہے "شبستان اردو ڈائجسٹ" اس کے نگران اور مدیران، سب مسلمان ہیں۔ اسکی اگست ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں جن سنگھ کے سابق صدر پروفیسر مدھوک کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس کے دوران وہ کہتے ہیں کہ:

> یہ بات قطعی صاف ہے کہ مسلمانوں کا نوے فی صد نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ پاکستانی ہے اور پاکستان کی طرف دیکھتا ہے۔ میرا اُن سے رات دن کا واسطہ رہتا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے۔

یہ غالباً انہی مسلمانوں کی حسرت بھری آواز تھی جو غالب کے ان الفاظ میں لب تک آئی تھی کہ:

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے۔

ہماری دوسری بڑی غلطی یہ تھی کہ ہم نے اپنی نئی نسل کے نوجوانوں کو بتایا ہی نہیں کہ ہندو کیا ہے؟ میں نے اس کی وضاحت اپنے اُس خطاب میں کی تھی جس کا میں نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ یہاں صرف چند ایک واقعات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ بہت زیادہ پیچھے نہیں جانا چاہتا۔ لالہ لاجپت رائے نے سیواجی کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ اس نے راجہ جے سنگھ کے نام اپنے خط میں تحریر کیا تھا:

ہندو کے عزائم

> میری تلوار مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہے۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ یہ تلوار مجھے اور ہی مہم کے لئے میان سے نکالنی پڑی۔ اسے مسلمانوں کے سر پر بجلی بن کر گرنا چاہیئے تھا جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ ہی انہیں انصاف کرنا آتا ہے۔ میری بادلوں کی طرح گرجنے والی فوجیں مسلمانوں پر تلواروں کا وہ مینہ برسائیں گی کہ دکن کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک سارے مسلمان اس سیلاب خون میں بہہ جائیں گے اور ایک مسلمان کا نشان بھی باقی نہیں رہیگا۔ (طلوعِ اسلام۔ جنوری ۴۷ء)

لالہ ہردیال کا شمار انقلاب پسند ہندوؤں میں ہوتا ہے۔ اس نے ۱۹۲۵ء میں کہا تھا کہ

> جب ہندو قوم میں پورا پورا جوش پیدا ہو جائے گا تو سوراج، شدھی اور افغانستان کی فتح کے علاوہ ممکن ہے کہ ہم مشرقی افریقہ، نجی اور دوسرے ملکوں پر قابض ہو جائیں جہاں ہندو بھائی آباد ہیں کیونکہ اس وقت ہم کسی ہندو بھائی کو غلامی کی حالت میں نہیں چھوڑیں گے پس ہندوستان کو اگر آزادی ملے گی تو یہاں نہ صرف ہندو راج قائم ہو گا بلکہ مسلمانوں کی شدھی، افغانستان کی فتح وغیرہ باقی نصب العین بھی پورے ہو جائیں گے۔ (ایضاً)

ہندوؤں کے مشہور مذہبی ریفارمر سوامی دیانند نے آریہ سماج کے نام سے ہندوؤں کی تنظیم کی تھی۔ اس تنظیم کا مقصد کیا تھا، اسے آریہ سماج کے ایک مشہور لیڈر لالہ دھنپت رائے نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

> ہندوستان میں سوائے ہندو راج کے دوسرا راج ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک دن آئے گا کہ ہندوستان کے سب مسلمان شدھ ہو کر آریہ سماج ہو جائیں گے اور اس طرح آخر یہاں ہندو ہی رہ جائیں گے۔ یہ ہمارا نصب العین ہے۔ یہی ہماری آرزو ہے۔ سوامی جی مہاراج نے آریہ سماج کی بنیاد اسی اصول کو لیکر ڈالی تھی (ایضاً)

اسی تنظیم کے ایک اور لیڈر پروفیسر رام دیو نے ۱۹۲۷ء میں اعلان کیا تھا کہ

> ہندوستان کی ہر ایک مسجد پر ہندو دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا بلند کیا جائے گا۔

کہا جائے گا کہ یہ ہندوؤں کے قدامت پرست، متعصب طبقہ کے خیالات تھے، ان کا قومیت پرست معتدل طبقہ ان خیالات کا حامی نہیں تھا۔ یہ بھی غلط ہے۔ تحریک پاکستان کی مخالفت میں کانگریسی ہندو پیش پیش تھے۔ یہ اس لئے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ آزادی کے بعد متحدہ ہندوستان میں جمہوری انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس حکومت میں ہندوؤں کی غیر متبدل اکثریت ہوتی اور مسلمان مستقلاً اقلیت میں رہتے۔ اس طرح مسلمان ابدالآباد تک ہندوؤں کے محکوم بن کر زندگی بسر کرتے۔ قائداعظمؒ نے انتہائی تدبر اور خلوص سے پاکستان کی جنگ لڑی اور تقسیم ہند کا مسئلہ انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ کے متفقہ فیصلہ کی رو سے طے پا گیا۔ لیکن دیکھئے کہ اس فیصلہ کے بعد وہاں کے ان روشن خیال، قومیت پرست ہندوؤں کی طرف سے کس ذہنیت کا مظاہرہ ہوا۔ کانگریس کی طرف سے تقسیم ہند کے فیصلے پر دستخط پنڈت جواہر لال نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس فیصلے پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ

> ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔
>
> (طلوع اسلام۔ مئی ۱۹۴۷ء)

۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا اور ۱۴ جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حسب ذیل ریزولیشن پاس کیا۔

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آ جائے

> گی تو ہندوستان کے مسئلے کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

خود مہاتما گاندھی نے پاکستان بننے کے تین دن پہلے کہا تھا کہ:

> اگر سارا ہندوستان جل کر راکھ ہو جائے ہم پھر بھی مطالبہ پاکستان منظور نہیں کریں گے خواہ مسلمان اسے بزورِ شمشیر ہی کیوں نہ طلب کریں۔

اور تشکیل پاکستان کے تین سال بعد راجہ مہندر پرتاب نے اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ

> جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اسطرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہو گئی ہے۔ بنا بریں میں حکومت ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔

اس کے بعد ہندوؤں نے پاکستان کے وجود کو ختم کرنے کے لئے جو کچھ کیا وہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ مجھے اسکی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

ہم نے تو ہندوؤں سے علیحدگی اختیار کی تھی اسلئے وہ ہم سے برسرِ پیکار چلے آ رہے ہیں لیکن جن مسلمانوں نے خود مسلمانوں سے غداری کر کے ہندوؤں کا ساتھ دیا تھا ذرا دیکھئے کہ ان کے ساتھ ہندوؤں کا برتاؤ کیا رہا؟ کشمیر کے شیخ عبداللہ نے جس غداری سے کشمیر کا الحاق ہندوستان سے کیا اس کا ہر ایک کو علم ہے۔ اب دیکھئے کہ ہندوؤں نے ان کے ساتھ کیا کیا۔ انہوں نے کشمیر کنونشن میں، جو ۱۹۷۰ء میں سری نگر میں منعقد ہوئی تھی، کہا کہ:

> میں نے کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق پر رضامندی سے ایک بہت بڑی حماقت کا ارتکاب کیا تھا۔ یہ حماقت اتنا بڑا جرم ہے جس کی پاداش میں میں ہر قسم کی سزا کا مستحق ہوں یہ حماقت اس لئے سرزد ہوئی کہ میں نے پنڈت نہرو پر اعتماد کر لیا تھا۔ میں نے انہیں اس درجے قابل اعتماد سمجھ لیا تھا کہ مجھے اس کا تصور تک نہیں آ سکتا تھا کہ وہ اپنے مقدس وعدوں اور محکم قول و قرار سے یوں پھر جائیں گے۔ پنڈت نہرو، کشمیر کو اہل ہند کی کالونی بنانا چاہتے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ان تمام وعدوں سے پھر گئے جو انہوں نے اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل سے کئے تھے۔ (اخبار کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ) اس مقام پر شیخ عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور انہوں نے کہا کہ میری یہ حماقت ایسا سنگین جرم ہے کہ قوم کو حق پہنچتا ہے کہ اسکی سزا کے طور پر وہ مجھے ٹھکرا دے۔ میں انتہائی تاسف سے اس کا اعتراف کرتا ہوں۔
>
> (طلوع اسلام - اگست ۱۹۷۰ء)

یہ ہے ہندو، نقاب اٹھ جانے کے بعد۔

بعض سادہ لوح مسلمان کہا کرتے ہیں کہ ہندو تو متعصب اور تنگ نظر ہے لیکن سکھ ایسے نہیں وہ بڑے کشادہ دل

واقع ہوتے ہیں۔ سکھوں کے متعلق ہماری یہ خوش فہمی ایسی ستم ظریفی ہے جس پر تاریخ خندہ زن ہے۔ سکھوں نے جو چند دنوں تک پنجاب پر حکومت کی تھی تو اس میں مسلمانوں کے ساتھ کس درندگی اور بربریت کا ثبوت دیا تھا، تاریخ کے اوراق اس سے آج تک خونچکاں ہیں۔ اس عہد کے متعلق "سکھا شاہی" کی اصطلاح وجود میں آگئی تھی۔ میں اس عہد سے آگے بڑھ کر تقسیم ہند کے دور میں پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ شروع ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے چرچے عام ہو رہے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ اس زمانے میں سکھوں کے ایک مسلمہ لیڈر تھے۔ وہ جگہ جگہ مسلمانوں کے خلاف انتہائی شرانگیز تقریریں کرتے تھے۔ انہوں نے ۲۸ فروری ۱۹۴۷ء کو ایک تقریر میں کہا:

سکھ اور مسلمان

> میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہم خانہ جنگی کو کیسے روک سکتے ہیں۔ جب تک مسلمان پنجاب پر راج کرنے کی خواہش ترک نہیں کریں گے اس وقت تک ان سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ سکھوں کے پاس اسقدر طاقت موجود ہے کہ وہ مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے نکال دیں۔ لیکن ہم اسی پر اکتفا کیوں کریں۔ ہم ان کو سارے پنجاب سے نکال دیں گے۔ ہم نے اس مقصد کے لئے اپنی نجی رضاکار فوج کی از سرِ نو تنظیم شروع کر دی ہے (طلوع اسلام - اگست ۱۹۴۸ء)

پھر انہوں نے ۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو ایک تقریر میں کہا:

> خالصہ پنتھ کو چاہیے کہ وہ اب موقع کی نزاکت کو سمجھے۔ میں ہر سکھ سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنا فرض ادا کرے۔ ہم زندہ رہیں یا مر جائیں لیکن مسلمان راج کی اطاعت تسلیم نہیں کریں گے۔ خالصہ اٹھو: اپنے لنگر لنگوٹ کس لو، نازک گھڑی آ پہنچی ہے۔ واہ گرو ہماری راہنمائی اور مدد کرے گا۔ (ایضاً)

۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو ماسٹر تارا سنگھ پنجاب اسمبلی ہال سے "پاکستان مردہ باد" اور "ست سری اکال" کے نعرے لگاتے اور اپنی کرپان لہراتے ہوئے نکلے اور انہوں نے اعلان کیا کہ:

> وقت آ گیا ہے کہ صرف تلوار کی طاقت کا راج ہو گا۔ سکھ تیار ہیں۔ ہم مسلمانوں کے ہوش ٹھکانے لگا دیں گے جب تک ہم پنجاب سے مسلم راج کا خاتمہ نہیں کر دیں گے ہماری تلوار نیام میں نہیں جائے گی۔ (ایضاً)

سکھوں کے ایک اور مشہور لیڈر، گیانی کرتار سنگھ نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

> آج کے دن سے ہماری مقدس جنگ شروع ہو گئی ہے۔ آج سے ایک سو سال بیشتر ہمارے زرد جھنڈے لاہور کے قلعے پر لہرا رہے تھے۔ یہی جھنڈا پھر لہرائے گا۔ یہ فیصلہ ہمارا جنگ کا کلہاڑا کرے گا کہ حکومت مسلمان کریں گے یا ہم۔ سکھ گرو گوبند سنگھ کے نام پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔

یہ تھے سکھوں کے عزائم پاکستان کے متعلق۔

تقسیم ہند کے وقت ہندوؤں اور سکھوں نے جس طرح مسلمانوں کا قتلِ عام کیا اس کے تصور سے فضا اس وقت تک کانپ رہی ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان میں تیسرا فریق انگریز بھی تھا جیسا جولائی ۱۹۴۸ء میں

ہندو، سکھ اور انگریز

پاکستان کے وزیر مالیات جناب غلام محمد صاحب لندن تشریف لے گئے تو انہوں نے وہاں ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ:

> جب تقسیم ہند کے زمانے کے حادثات کی تاریخ لکھی جائے گی تو ان کا الزام ایک حد تک بلکہ تقریباً کاملاً اس شخص پر آئے گا جو اس وقت وائسرائے تھا۔ پنجاب کے فسادات ایک گہری سازش کا نتیجہ تھے اس سازش میں ایک طرف سکھوں کا وہ جنگجو طبقہ شریک تھا جو وہاں اپنا راج قائم کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف راشٹریہ سیوک سنگھ کے یہ کمینہ عزائم تھے کہ مسلمان آبادی کا صفایا کر کے پاکستان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ تقسیم سے پہلے حکومت ہند کو ان سرگرمیوں کا بخوبی علم تھا لیکن ان کے سدِّباب کے لئے کچھ کاروائی نہیں کی گئی۔ وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پورا علم تھا کہ یہ فتنہ کھڑا کیا جا رہا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ اسلحہ جمع کیا جا رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ سکھ کیا کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو کیسے ستایا جا رہا ہے۔ اسکی سی۔ آئی۔ ڈی نے یہ معلومات اُسے بہم پہنچا دی تھیں اور اس کے رفقائے کونسل کچھ کرنے کیلئے دہائی دے رہے تھے لیکن وہ اپنی کابینہ کے مسلمان ارکان کو جھوٹی طفل تسلیاں دیتا رہا۔ (طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۴۸ء)

سکھوں نے کس درندگی سے مسلمانوں کا خون بہایا تھا، اس لرزہ انگیز داستان کو چھوڑیئے۔ ان کی وحشت اور بربریت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ 'تحقیقاتی اداروں کے جمع کردہ اعداد و شمار کی رُو سے' وہ 'کم از کم بیس ہزار معصوم نوجوان لڑکیوں کو مسلمانوں کے متاع بردہ قافلوں سے لوٹ کر لے گئے تھے! اس مقام پر عزیزانِ من! مجھے اس ندامت آگیں واقعہ کی یاد تازہ کرانے پر معاف رکھئے جس کے تصور سے نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ ان روح فرسا قیامت خیز حوادث کے بعد جب ایک میچ کے سلسلہ میں، یہی سکھ لاہور آئے تو یہاں ان کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ انہیں پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور راستوں میں سبیلیں لگائی گئیں۔ ہم یہ کچھ کر رہے تھے اور آسمان کے فرشتے ہم پر یہ کہہ کر لعنتیں برسا رہے تھے کہ۔ حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے:

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ہندو ہو یا سکھ، انگریز ہو یا امریکی، مسلمان دشمنی میں ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ہمیں واضح الفاظ میں متنبہ کرتا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ۔ اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی (غیر مسلم) کو اپنا ہمراز اور معتمد نہ بناؤ۔ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا۔ یہ لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ۔ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ تمہیں نقصان پہنچے۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ ج وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُھُمْ اَکْبَرُ۔ کچھ منصوبے تو ان کے منہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اِنْ تَمْسَسْکُمْ حَسَنَۃٌ تَسُؤْھُمْ۔ اگر کہیں تمہارے لئے کوئی نفع بخش بات ہو جائے تو وہ ان کے لئے غم کا موجب بن جاتی ہے۔ وَاِنْ تُصِبْکُمْ سَیِّئَۃٌ یَّفْرَحُوْا بِھَا۔ (۱۲۰-۱۱۹/۳) اور اگر تم پر کوئی مصیبت آ جائے تو یہ اس پر جشن مناتے ہیں۔ چنانچہ اس نے یہ کہہ کر بات صاف کر دی کہ

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ
وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ۔

(۲۲/۵۸)

> تم کبھی ایسا نہیں دیکھو گے کہ وہ لوگ جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے دوستداری کے تعلقات قائم کرنے لگ جائیں جو خدا اور رسول کی مخالفت کرتے ہیں خواہ وہ ان کے باپ، بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔

قرآن کریم کی رُو سے، غیر مسلموں سے معاہدات کی رُو سے معاملات طے ہو سکتے ہیں۔ ان سے دوستداری کے تعلقات قطعاً قائم نہیں ہو سکتے۔ اور معاہدات میں بھی ان سے بڑا محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پر کبھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم اپنی نئی نسل کے نوجوانوں کے سامنے یہ حقائق پیش کرتے اور انہیں مسلسل اور متواتر یہ بتاتے رہتے کہ ہندو اور ہندو ازم کیا ہیں اور، پاکستان ہی نہیں، مسلمانوں اور خود اسلام کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کیلئے ان کے عزائم کیا ؟ اگر ہم ایسا کرتے تو ہمارے ان نوجوانوں کے دلوں میں نہ کبھی اس قسم کے خیالات پیدا ہوتے کہ ہم نے ہندوؤں سے الگ ہو کر غلطی کی اور نہ ہی ان کے سینے میں اس قسم کی آرزوئیں کروٹ لیتیں کہ ہمیں پھر سے ہندوؤں کے ساتھ مل جانا چاہیئے۔ اسکے برعکس ان کے دل میں وہ جذبہ موجزن رہتا جس کا مظاہرہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہمارے ایک مجاہد فوجی افسر نے کیا تھا۔ مشہور ہندوستانی صحافی کلدیپ نیر نے اس جنگ کے سلسلہ میں اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ فیروزپور کے محاذ پر ایک زخمی مسلمان فوجی افسر کو قید کیا گیا۔ زخموں کی کثرت سے اس کے جسم سے بہت سا خون خارج ہو چکا تھا اور اس کی حالت بڑی نازک تھی۔ اُسے نیم بیہوشی کی حالت میں اپریشن ٹیبل پر لٹایا گیا اور جلدی سے خون دینے کا انتظام کیا گیا۔ اُس نے اپنی آنکھ کھولی اور پوچھا کہ یہ خون کس کا ہے جو آپ مجھے دینا چاہتے ہیں ؟ انہوں نے کہا کہ یہ ہمارے نوجوانوں کا خون ہے۔ اس نے جواب دیا، آپ دل تھام کر سنیئے کہ کیا جواب دیا۔ اس نے کہا کہ میں ایسی زندگی پر جسمیں میری رگوں میں ہندو کا خون موجزن ہو، موت کو ہزار بار ترجیح دوں گا۔ یہ کہا اور اپنا بازو سکیڑ لیا اور چند ہی لمحوں بعد اس نے نہایت سکون سے جان دے دی۔

اگر ہم اپنی نئی نسل کو بتلاتے کہ ہندو کیا ہے، تو انکے دلوں میں اسی قسم کے جذبے موجزن ہوتے۔ اور پھر ہندو کو اسکی کبھی جرأت نہ ہوتی کہ وہ پاکستان کیطرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ لیکن یہاں کیفیت یہ ہے کہ قوم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ہندو کسقدر انسانیت کا ہمدرد اور ہمارا محسن ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ہندوؤں کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کے سلسلہ میں جو کچھ ہُوا، اس کے بعد ایک نظر اس پریس کانفرنس کی رپورٹ پر ڈالیئے جس سے، ۱۹؍جنوری ۱۹۷۲ء کو، کراچی میں، نواب محمد اکبر بگتی نے خطاب کیا تھا۔ رپورٹ یہ تھی

> گذشتہ دنوں کوئٹہ کے ایک جلسہ میں اندرا گاندھی زندہ باد، بنگلہ دیش زندہ باد، جگ جیون رام زندہ باد، دُکھی انسانیت کا ہمدرد روس زندہ باد اور پاکستان مردہ باد کے نعرے لگائے گئے، جب نواب بگتی سے ان نعروں پر تبصرہ کرنے کیلئے کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ اسمیں کیا حرج ہے ایک حصہ کھو کر پاکستان مردہ ہو چکا ہے اور اگر ہم اندرا گاندھی کو زندہ باد نہ کہیں جس نے ساٹھ لاکھ پناہ گزینوں کو پناہ دی جب کہ مسلم فوج انکی عزت اور آبرو لوٹنے کے درپے تھی اور انہیں قتل کر رہی تھی تو پھر کسے زندہ باد کہیں انہوں نے بھارتی فوجوں کو غاصب افواج ماننے کے بجائے اتحادی فوج قرار دیا۔ (طلوعِ اسلام۔ مارچ ۱۹۷۲ء)

اور یہ زندہ باد کے نعرے اُن ہندوؤں کیلئے لگائے گئے تھے جو ہر وقت اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں کہ کس طرح دنیا کے نقشے سے پاکستان کے نام تک کو مٹا دیا جائے۔ میں نے اوپر پروفیسر بلراج مدھوک کے ایک حالیہ انٹرویو کا ذکر کیا ہے۔ اسکے دوران اس نے کہا کہ

> میری سیاسی پیشن گوئی ہے کہ پاکستان دنیا کے نقشے سے ختم ہو جائے گا۔ جو مسلمان بنگلہ دیش گیا وہ وہاں پٹ رہا ہے، جوتے کھا رہا ہے۔ یو پی اور دہلی سے جو مسلمان سندھ گیا اُسے وہاں بوجھ کیا جا رہا ہے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ پاکستان دنیا کے نقشے سے ختم ہو جائے گا اسکی ایک خاص وجہ ہے پختونستان کو افغانستان کے ساتھ ملنا ہے۔ بلوچستان ایران کے ساتھ جائے گا۔ دنیا میں آج جو چھوٹی چھوٹی قوتیں سر اٹھا رہی ہیں اس کے پیشِ نظر یہی ہونا ہے۔ اسکو روکا نہیں جا سکتا۔ اب رہا سندھ اور پنجاب، تو پنجاب مغربی پاکستان کی سامراجی طاقت ہے۔ وہ سندھی بلوچی اور پختونوں پر حکومت کر رہا ہے۔ ان پر اسکی سلطنت ہے۔ جیسے ہی یہ سلطنت اس کے ہاتھ سے نکلی، اُسی وقت وہ ہندوستان سے مل جائے گا۔ اس وقت ہندو پنجابی اور مسلمان پنجابی باہم گلے مل جائیں گے۔
>
> یہ ہیں اس ہندو کے عزائم، جس کے لئے زندہ باد کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔

(۰)

دو قومی نظریہ

اور اب ہم خارجی محاذ سے پیچھے ہٹ کر اپنے داخلی محاذ کی طرف آتے ہیں۔ مملکت پاکستان کی عمارت دو ستونوں پر قائم ہوئی تھی۔ یعنی دو قومی نظریہ اور پاکستان آئیڈیالوجی۔ ان دونوں کے ساتھ ہم نے جس قدر منافقت برتی ہے اُسکی داستان بڑی عبرت انگیز ہے۔ دو قومی نظریہ سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر غیر مسلموں سے ایک الگ قوم ہیں اور کوئی غیر مسلم اس قوم کا فرد نہیں ہو سکتا۔ ہم چھبیس سال سے اس نظریہ کو دہراتے چلے آ رہے ہیں اور اسی تسلسل سے عمل اس کے خلاف کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے مملکت پاکستان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ملا کر ایک قوم قرار دے رکھا ہے، اور اس متحدہ قومیت کو آئینی حیثیت دے رکھی ہے۔ آپ سوچئے کہ قول اور عمل میں تضاد کی اس سے زیادہ نمایاں مثال کہیں اور مل سکے گی؟ چونکہ ہم دو قومی نظریہ کے الفاظ زبان سے دہراتے اور عملاً اسکی تکذیب کرتے تھے، یہاں کے ہندوؤں کو اسکی جرأت ہو گئی کہ وہ اعلانیہ اس نظریہ کی تکذیب کریں۔ آپ کو شاید یاد نہ ہو کہ ۱۹۵۶ء میں ہماری مرکزی مجلس آئین ساز کے غیر مسلم اراکین کے لیڈر مسٹر چٹو پادھیہ مجلس کے بھرے اجلاس میں اکثر اعلان کیا کرتے تھے کہ

> ہمارا عقیدہ ہے کہ پاکستان میں صرف ایک قوم بستی ہے وہ دن دور نہیں جب یہ تصور حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا اور میں مرنے سے پہلے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا۔
>
> (طلوع اسلام - اکتوبر ۱۹۵۶ء)

مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا وہ بنیادی طور پر اسی کا نتیجہ تھا کہ ہم نے ہندوؤں کو اپنی قوم کا جزو قرار دے رکھا تھا۔ آپ سوچئے کہ قرآن کریم کی تاکید تو یہ تھی کہ تم انہیں رموزِ مملکت میں بھی شریک نہ کرو لیکن ہمارے ہاں

کیفیت یہ تھی کہ ہماری مملکت کا کوئی راز بھی ایسا نہیں تھا جو ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو۔ یہی کیفیت سندھ میں ہے اور جو کچھ ہندوؤں نے مشرقی پاکستان میں کیا تھا اسی کو اب وہ سندھ میں دہرانا چاہتے ہیں۔

لیکن اس سے بھی عجیب تر صورت یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ملا کر ایک قوم قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف خود مسلمانوں میں صوبائی، نسلی' اور لسانی تفریق کی بنا پر چار قومیتوں کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ یعنی ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم' اور خود مسلمانوں کے اندر چار قومیتیں! اور وہ بھی ایسی مستحکم کہ ان میں سے ہر قوم اپنی الگ جداگانہ آزاد مملکت کے خواب دیکھتی اور اب کھلے بندوں اس کا دعویٰ کرتی ہے۔ نسل، زبان، جغرافیائی حدود وغیرہ کے اشتراک کی بناء پر الگ الگ قومیتوں کا تصور نہ صرف اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے بلکہ نظریہ پاکستان کے بھی خلاف' اور آئین پاکستان سے کھلی ہوئی غداری۔ لیکن اس کے باوجود، جداگانہ قومیتوں کے ان مدعیوں کے خلاف یہاں کسی چارہ جوئی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

نظریۂ پاکستان

باقی رہا نظریۂ پاکستان' تو اس کے ساتھ بھی ہم اسی طرح منافقت برت رہے ہیں۔ چار لفظوں میں' نظریۂ پاکستان کا مفہوم یہ ہے کہ مملکت اپنا تمام کاروبار قرآن کریم کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے گی۔ ہم نے یہ الفاظ قرارداد پاکستان میں بھی درج کر لئے اور اس کے بعد انہیں پاکستان کے ہر آئین میں دہراتے چلے آ رہے ہیں لیکن عملاً یہاں سیکولر نظام رائج ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں بعض پارٹیوں نے اپنے منشور میں یہ لکھ رکھا ہے کہ پاکستان کا نظام حکومت سیکولر ہو گا۔ اور اب یہاں بڑے بڑے ممتاز رہنما بھی اس کا اعلان کرتے چلے جا رہے ہیں۔ مثلاً گذشتہ فروری میں پیپلز پارٹی کے جنرل سیکرٹری اور مرکزی کابینہ کے وزیر مسٹر جے۔ اے رحیم نے لاہور میں ایک عشائیہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> اگر پاکستان کے لوگ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ نظریات اور ماضی کی قراردادوں کا ذکر کرنا چھوڑ دیں۔ (طلوع اسلام - مارچ ۱۹۷۳ء)

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ دو قومی نظریہ اور آئیڈیالوجی آف پاکستان وہ دو ستون ہیں جن پر مملکت پاکستان کی عمارت استوار ہے، سوچئے کہ جس عمارت کے بنیادی ستونوں کی یہ حالت ہو اس کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنے کے لئے کسی منجم کی ضرورت پڑے گی؟ طلوع اسلام شروع سے کہتا چلا آ رہا ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد کو سنجیدگی سے فیصلہ کرنا چاہیئے کہ وہ کس روش پر چلنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ دیانتداری سے سمجھتے ہیں کہ یہاں قرآنی نظام رائج ہونا چاہیئے تو پھر انہیں عملاً یہ روش اختیار کرنی چاہیئے' اور اگر وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اُن کے بس کی بات نہیں تو پھر انہیں علانیہ اس کا اعتراف اور اعلان کر کے کہہ دینا چاہیئے کہ یہاں متحدہ قومیت اور سیکولر نظام رائج ہو گا۔ یاد رکھیئے! اسلام تو جس قدر درخشندہ نتائج اپنے اندر رکھتا ہے وہ ظاہر ہیں۔ کفر بھی کچھ نہ کچھ نتائج ضرور پیدا کر لیتا ہے' خواہ وہ وقتی اور عارضی ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن منافقت کا نتیجہ تخریب اور انتشار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے منافقین کا مقام جہنم کا پست ترین درجہ بتایا ہے۔ وہ پست ترین درجہ جس میں ہم اس وقت گر چکے ہیں۔

* * *

ہمارے جرائم کی فہرست میں، اگلی شق، صوبائی تقسیم کی آتی ہے، صوبوں کی اس سے زیادہ حیثیت کیا تھی کہ انگریز نے

صوبائی تقسیم

انتظامی سہولت کی غرض سے ملک کو مختلف خطوں میں بانٹ دیا تھا۔ لیکن بجائے اسکے ہم ان لکیروں کو مٹا دیتے ہم نے انہیں ایسا پختہ کر دیا کہ یہ صوبے الگ الگ ملک بن گئے۔ یہ بڑی خطرناک علامت تھی جس کے خلاف طلوع اسلام نے ہمیشہ آواز بلند کی۔ ہم نے کہا، کہ یہاں وحدانی طرز حکومت قائم کرنی چاہیئے تاکہ ہم میں ملی اور مملکتی وحدت زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتی چلی جائے۔ لیکن بجائے اس کے کہ ہم ایسی وحدت قائم کرتے ہم نے ملازمتوں تک میں صوبائی تناسب کا اصول اختیار کر لیا۔ یہ وہ تخم خبیث تھا جس کا نتیجہ مستقل منافرت، رقابت اور عداوت کی شکل میں نمودار ہوتا چلا گیا۔ جب غیر منقسم ہندوستان میں مسلم لیگ کیطرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب الگ مقرر ہونا چاہیئے تو خود مسلمانوں میں سے بعض رہنماؤں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ ہمیں بلند سیاسی مفادات سے نیچے اتر کر "روٹیوں کی بانٹ" کی سطح پر نہیں آ جانا چاہیئے۔ اس کے جواب میں کہا گیا تھا کہ یہ مسئلہ روٹیوں کی بانٹ کا نہیں اس سے ہر قدم پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے الگ الگ قومی تشخص کا جذبہ ابھرے گا اور اسطرح یہ خلیج اتنی وسیع ہو جائے گی کہ اسے کوئی پاٹ نہیں سکے گا۔ اس دلیل کی بناء پر اس اصول کو متفقہ طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ جب پاکستان میں ملازمتوں میں صوبائی تناسب کی تجویز زیر غور آئی تو طلوع اسلام نے اسی دلیل کو دھرایا اور ذمے دار ارباب سے کہا کہ اس جداگانہ تناسب نے جو نتیجہ ہندوستان میں پیدا کیا تھا وہی نتیجہ یہاں پیدا ہو گا۔ یعنی اس سے مختلف صوبوں میں بسنے والے مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت، رقابت اور عداوت کے جذبات ابھریں گے اور اسطرح بین الصوبائی خلیج اتنی وسیع ہو جائے گی کہ پھر یہ کسی کے پاٹے، پٹ نہیں سکے گی۔ لیکن مفاد پرستیوں کے نقار خانے میں طوطی کی اس آواز کو کسی نے درخورِ سماعت قرار نہ دیا۔ یہ نہیں کہ ان حضرات کو اس کا احساس نہیں تھا۔ احساس ضرور تھا۔ مثلاً ۲۲ر نومبر ۱۹۵۴ء کی شام اُس زمانے کے وزیر اعظم نے کراچی ریڈیو سے یہ اعلان کیا کہ:

> آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے یکم نومبر کے براڈ کاسٹ میں صوبائی تعصب کے خطرات کی طرف توجہ دلائی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سب صوبائیت کے خطرے سے آگاہ ہوں گے۔ پاکستان میں باہمی تفریق کی ایسی مصنوعی لکیریں کھنچی ہوئی ہیں جن سے ہماری قومی وحدت قائم نہیں رہتی۔ ہمیں بلا استثناء سب کو یقین ہو چکا ہے کہ جب تک ان مصنوعی حد بندیوں کو توڑا نہ جائیگا صوبائی تعصب کی لعنت دور نہیں ہو گی۔ اب یہ مطالبہ چاروں طرف سے اٹھ رہا ہے کہ صوبائیت کی یہ لعنت جو ملتِ واحدہ کی حیثیت سے ہمارے وجود ہی کو خطرہ میں ڈال رہی ہے اس کا استیصال ضروری ہے۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی، ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اور یہی وہ آئیڈیالوجی ہے جو تمام اہلِ پاکستان کو ایک ملت بنا سکتی ہے۔
>
> (طلوع اسلام دسمبر ۱۹۵۴ء)

اُسکے بعد انہوں نے فرمایا:

> کچھ عرصہ پہلے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے نزدیک بہترین اندازِ حکومت وحدانی انداز تھا، لیکن چونکہ تمام پاکستان کو ایک وحدت بنانا ممکن نہیں اس لئے ہمیں کم از کم مغربی پاکستان کو

> ایک وحدت بنا دینا چاہیئے۔ مغربی پاکستان کی موجودہ صوبائی تفریق کے لئے کوئی وجہِ جواز نہیں۔ سات سال میں اس مصنوعی تقسیم نے تشتت و انتشار کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کیا۔ ویسے بھی ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم ایسے انداز کی حکومت کی مسرفانہ عیاشی کو برداشت کر سکیں جس میں چھ یا سات الگ الگ اسمبلیاں، الگ الگ وزارتیں، الگ الگ سیکرٹریٹ اور خدا جانے کیا کیا الگ الگ ساز و سامان ہونگے۔ لہذا، یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دیا جائے۔

بنانے کو تو مغربی پاکستان کو ایک وحدت۔ بنا دیا لیکن یہ وحدت صرف میکانکی وحدت تھی اس سے جو کچھ حقیقتاً مقصود تھا اسکے حصول کے لئے کوئی کوشش نہ کی گئی یعنی قوم کے دل سے صوبائی تفریق کے جذبہ کو نکال کر اسے امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھال دینا۔ اس کے برعکس، مفاد پرستوں کی سازشیں اور نظم و نسق کی خرابیاں اس میکانکی وحدت کو بھی کمزور سے کمزور تر کرتی چلی گئیں۔ نتیجہ یہ کہ مشرقی پاکستان جسے اس وحدت کا جزو نہیں بنایا گیا تھا' پاکستان ہی سے الگ ہو گیا' اور مغربی پاکستان میں پھر سے فیڈرل حکومت قائم کر دی گئی۔ اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ملک میں موجودہ انتشار کے عذاب میں، ہمارے اس جرم کا بھی نمایاں حصہ ہے۔

غداران وطن

اب ہم اپنی الم انگیز داستان کے اس باب پر آتے ہیں جس میں حیرت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا وہاں کی کیفیت کے متعلق بصد حسرت یہ کہنا پڑتا ہے کہ

ہم اپنی روداد کیا سنائیں، کچھ ایسے ہیں واقعات ایسے
اگر کوئی دوسرا سناتا ہمیں سمجھتے اسے فسانہ

اور اس باب کا عنوان ہے۔ پاکستان میں غداران وطن کی موجودگی۔

تشکیل پاکستان کے چند ہی ماہ بعد قائداعظمؒ نے اپنی ڈھاکہ کی تقریر میں فرمایا کہ:

> میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر وہ لوگ موجود ہیں جو بیرونی قوتوں سے مالی امداد حاصل کر کے پاکستان کے درپے تخریب ہیں۔ میں آپ لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ان سے ہوشیار رہیں اور ان کے دلکش نعروں اور جاذبِ توجہ وعدوں کے فریب میں نہ آ جائیں۔
>
> (طلوع اسلام۔ مئی ۱۹۴۸ء)

اس کے بعد وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خاں صاحب نے (۱۳) اپریل ۱۹۴۸ء کو اپنے ایک بیان میں کہا:

> بعض سازشی گروہ ملازمین حکومت کی مشکلات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے مقاصد براری میں استعمال کرنا چاہتے ہیں، لیکن وہ اپنے مشئوم عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے کیونکہ ملازمین کے دل میں کھوٹ نہیں۔ وہ انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ ملازمین میں انتشار اور سرکشی پیدا کر کے نظام حکومت کو مفلوج کر دیں۔ (ایضاً)

ہم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ حکومت کو چاہیئے کہ یا تو ایسے سازشی عناصر کے خلاف مقدمات چلا کر انہیں قرار واقعی سزا دے اور یا (کم از کم) ان گروہوں کی نشاندھی کر کے قوم کو بتا دے۔ تاکہ وہ ان کی ریشہ دوانیوں سے محتاط رہ سکے۔ اس قسم کے مبہم بیانات سے سوائے اس کے کہ افواہیں پھیلانے والوں کو ایک حربہ ہاتھ آجائے، ملک اور قوم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن نہ تو ان غداروں کے خلاف کوئی کاروائی کی گئی اور نہ ہی انکی کوئی نشاندھی۔ البتہ اس قسم کے بیانات کا سلسلہ بدستور جاری رہا اور ہر نئے آنے والے نے اس نظم مرصّع میں ایک آدھ بند کا اضافہ کر دیا۔ مثلاً جنوری ۱۹۵۶ء میں گورنر جنرل پاکستان نے مشرقی بنگال کی ایک تقریر میں فرمایا:

> ملک میں ایسی جماعتیں بھی ہیں جو اس پست سطح پر پہنچ چکی ہیں کہ وہ بیرونی جماعتوں سے سازباز رکھتی ہیں اور انہیں اپنے ملک کے خلاف مسالہ فراہم کرتی رہتی ہیں۔ ایسے افراد یا جماعتوں کے استیصال کے لئے حکومت سخت سے سخت اقدام پر حق بجانب ہوگی۔ (طلوع اسلام مارچ ۱۹۵۶ء)

اس کے دو ہی دن بعد وزیر اعظم پاکستان نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> ملک میں ایسے عناصر موجود ہیں جو یاس و ناامیدی اور ہراسانی کے احساس کو عام کر رہے ہیں اور اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے استحکام اور سالمیت کو تباہ کر دیا جائے۔ انکی ایسی کاروائیوں کا جواب یہ ہے کہ مسلم لیگ کو دوبارہ زندہ کر دیا جائے۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ سازشی گروہوں کی سرگرمیوں کے استیصال کے لئے علاج کیا تجویز فرمایا گیا؟ بہرحال اس قسم کی بیان بازیوں کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ لیکن قوم نے کسی غدار کو برسر دار دیکھا نہ جلا وطن ہوتے پایا، حتیٰ کہ یہ بدقسمت ملک موجودہ دور میں آپہنچا۔ جون ۱۹۷۲ء میں صدر پاکستان (مسٹر بھٹو) نے ایک پریس کانفرنس میں فرمایا کہ:

> حکومت کے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہے کہ بعض اشخاص بیرونی قوتوں کے ایجنٹ کے طور پر ملک میں خلفشار اور انتشار مچاتے رہتے ہیں۔ بعض ممالک پاکستان میں سازشیں کرنے کیلئے مصروف جدوجہد ہیں لیکن میں ان ممالک کا نام لینا نہیں چاہتا۔
>
> (طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۷۲ء)

اس سے دو ہی ماہ قبل سندھ کے وزیر اعلیٰ ممتاز علی بھٹو صاحب نے اپنے ایک بیان میں فرمایا کہ "سندھو دیش کا نعرہ لگانے والے بھارتی ایجنٹ ہیں۔ ان عناصر کی تحریک پورے طور سے پاکستان دشمن تحریک ہے اور اس تحریک کو بھارت سے مالی امداد مل رہی ہے۔" (طلوع اسلام۔ جون ۱۹۷۲ء)

اب آیئے مشرقی پاکستان کی طرف۔ مئی ۱۹۷۱ء میں مولوی فرید احمد، نائب صدر، پاکستان، جمہوری پارٹی مشرقی پاکستان نے، راولپنڈی میں مقامی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> شیخ مجیب، تاج الدین اور قمر الزمان کو ۱۹۶۷ء میں، غیر ملکوں نے اپنا ایجنٹ مقرر کیا کہ وہ نظریۂ پاکستان کو ناکام بنا دیں۔ (طلوع اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

اسی زمانے میں خان عبد القیوم خانصاحب نے انکشاف فرمایا کہ شیخ مجیب الرحمان نے ۱۹۶۵ء میں منعم خان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ آزادی کا اعلان کر دے۔ (ایضاً)

اسی شیخ مجیب نے اپنے چھ نکات کا اعلان کیا اور طلوع اسلام نے ان کی بڑی شدت سے مخالفت کی۔ مسٹر بھٹو نے اگست ۱۹۷۱ء میں اپنا وہ شہرہ آفاق کتابچہ شائع کیا جس کا نام ہے (THE GREAT TRAGEDY) اس میں انہوں نے شیخ مجیب کی سازشوں اور آخرالامر بغاوت کے متعلق بڑے عجیب و غریب حقائق کا انکشاف فرمایا ہے۔ میں اس مقام پر ان کا ملخص پیش کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے چھ نکات کے متعلق لکھا کہ

> یہ فارمولا ایسی کنفیڈریشن کا نقاب پوش منشور تھا جس میں آئینی طور پر علیحدگی کے بیج پوشیدہ تھے۔ (ص۱۱)۔ یہ فارمولا ہماری قومیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا۔ اس سے پہلے دو پاکستان وجود میں آجاتے اور اس کے بعد یہ ملک پانچ آزاد مملکتوں میں تقسیم ہو جاتا (ص۱۳)

اسکے بعد انہوں نے لکھا کہ "مغربی پاکستان کے چند ایک لیڈر شروع ہی سے مجیب کی تائید کرنے لگ گئے۔ اس لئے کہ وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ مغربی پاکستان میں اپنے اپنے صوبوں کو علیحدہ کرائیں۔ یہ وہی حضرات تھے جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ ان لیڈروں نے دیکھا کہ چھ نکات میں ان کے لئے پاکستان کو تباہ کر دینے کا موقع تھا" (ص۱۴)

شیخ مجیب کی بغاوتی سرگرمیوں کے سلسلے میں اس کے خلاف ایک مقدمہ چلایا گیا جو اگرتلہ کیس کے عنوان سے مشہور ہے۔ ابھی وہ کیس زیر سماعت تھا کہ مغربی پاکستان کے لیڈروں نے صدر ایوب پر دباؤ ڈال کر اس مقدمہ ہی کو کالعدم قرار دلوا دیا اور شیخ مجیب دندناتا ہوا باہر آگیا۔ محترم بھٹو نے ستمبر ۱۹۷۲ء میں کہا تھا کہ "انہوں نے اس کیس کا فائل دیکھا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مجیب واقعی بغاوت کے جرم کا مرتکب ہوا تھا" لیکن حکومت نے نہ تو مجیب کے خلاف کوئی کارروائی کی اور نہ ہی ان لوگوں کے خلاف جنہوں نے دباؤ ڈال کر مقدمہ کو واپس کرایا تھا حالانکہ قانون کی رو سے اُن کا ایسا اقدام بجائے خویش ایک سنگین جرم تھا۔ ۱۹۷۱ء کے خونچکاں حوادث کے بعد شیخ مجیب کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان ... لایا گیا اور ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ نومبر ۱۹۷۱ء میں اُس وقت کے صدرِ مملکت نے امریکن میگزین 'نیوز ویک' کے ایڈیٹر کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ:

> یہ شخص مجھ سے دو سال تک داخلی خود مختاری کے مسئلہ پہ بات چیت کرتا رہا اور آخرکار اپنے الفاظ سے پھر گیا۔ اس نے مملکت کے خلاف مسلح بغاوت کو منظم بھی کیا اور اسکی قیادت بھی کی۔ اس نے چھ بٹالین فوج، پولیس اور ایسٹ پاکستان رائفلز کو جو قریب ساٹھ ہزار نفری پر مشتمل تھی، حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ ان کے ساتھ ہندوستانی ایجنٹ بھی شامل تھے۔ (طلوع اسلام۔ دسمبر ۱۹۷۱ء)

محترم بھٹو نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں شیخ مجیب کے کردار اور اعمال کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بڑا بصیرت افروز، عبرت انگیز اور حقیقت کشا ہے۔ اس مقام پر میں اس کا ملخص پیش کرتا ہوں۔ (تفصیل ان امور کی طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۷۲ء میں ملے گی) انہوں نے کہا تھا:

> مجیب کے دل میں مغربی پاکستان کیلئے سخت نفرت تھی جسے وہ تصنع کے نقاب میں چھپائے رکھتا تھا (ص۱۳)۔ ایک آزاد "بنگلہ دیش" کے لئے ہندوستان کیطرف سے سازش تقسیم ہند

کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی، اور اگرتلہ کیس کے بعد اس کی شدت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ (ص ۵۷)۔ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد مشرقی پاکستان کے اُس وقت کے گورنر منعم خان نے صدر ایوب کو رپورٹ بھیجی تھی کہ جنگ کے دوران مجیب نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اعلان کر دے کہ وہ آزاد بنگال کا وزیر اعظم ہے اور اس طرح مغربی پاکستان سے تعلق ختم کر دے (ص ۶۵)۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخاب سے کچھ عرصہ پہلے میں صدر کے پرنسپل سٹاف آفیسر، لیفٹننٹ جنرل پیرزادہ سے ملا۔ دورانِ گفتگو انہوں نے مجھ سے براہ راست یہ سوال کیا کہ میرے خیال میں مجیب کے حقیقی عزائم کیا ہیں۔ میں نے بلا کسی جھجک اور تامّل کے کہا، علیحدگی۔ (ص ۵۷)

یہ تھے مجیب کے عزائم کے متعلق وہ انکشافات جنہیں محترم بھٹو نے اگست ۱۹۷۱ء میں عام کیا۔ جب وہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے اسی مجیب کو بلا مشروط رہا کر کے بنگلہ دیش بھیج دیا۔ اسکے محرک کوئی مملکتی مصالح ہوں گے، لیکن وہ قوم کے سامنے نہیں آئے۔ اور ہماری تو یہ کیفیت ہے کہ

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند ۔ گدائے گوشہ نشینی تو حافظا! مخروش

مجیب نے وہاں جاتے ہی آزاد بنگلہ دیش کا اعلان کر دیا۔

بنگلہ دیش

بنگلہ دیش کا مسئلہ بڑا صاف اور سیدھا ہے۔ مشرقی پاکستان مملکتِ پاکستان کا ایک صوبہ تھا۔ اس صوبہ نے مملکت کے خلاف بغاوت کی اور بیرونی طاقتوں کی مدد سے اسمیں کامیابی حاصل کر کے اپنی آزاد مملکت کا اعلان کر دیا۔ یہ کھلی ہوئی بغاوت تھی اور بھارت اس بغاوت کو کامیاب بنانے کا وسیلہ۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر عدالت میں یہ دونوں سخت ترین سزا کے مستوجب تھے۔ ہمیں اس مسئلہ میں یہی موقف اختیار کرنا چاہیے تھا اور دنیا کو بتانا چاہیے تھا کہ یہ کس قسم کی کھلی ہوئی دھاندلی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں سے اس سلسلے میں جو آوازیں بلند ہوئیں، انہیں سننے کے بعد سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پیٹ لے اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ آواز یہ بلند ہوئی کہ مشرقی بنگال نے اس علیحدگی سے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا، بلکہ انہوں نے اپنا ایک ایسا حق لیا ہے جسے مملکتِ پاکستان تیس سال سے دبائے بیٹھی تھی۔ وضاحت: اس کی یوں کی گئی کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیشن میں "دو آزاد مملکتوں کے قائم کرنے کی اسکیم تھی"۔ پاکستان اس قرارداد کی کھلی ہوئی خلاف ورزی تھی۔ ایسا کہنے والوں نے قطعاً نہ سوچا کہ وہ اس جرم کے مرتکب کس کس کو قرار دے رہے ہیں؟ محترم بھٹو نے ان فتنہ پردازوں کی تردید ان الفاظ میں کی:

> گذشتہ چند سالوں میں اس ملک کے دو بازوؤں میں باہمی مناقشت کی وجہ سے اس ریزولیشن کے متعلق ایک تلخ سی بحث کا از سرِ نو آغاز کر دیا گیا ہے۔ پہلے ۱۹۶۶ء میں شیخ مجیب الرحمٰن نے اور پھر مولانا بھاشانی نے کہا کہ لاہور ریزولیشن میں دو آزاد مملکتوں کا تصور موجود ہے۔ ایک مشرقی بازو میں اور ایک مغربی بازو میں۔ یہ لاہور ریزولیشن کی دیانتدارانہ تعبیر نہیں۔ تاسیسِ پاکستان کے وقت سے لیکر ۱۹۶۶ء تک کسی نے بھی اس ریزولیشن کو سنجیدگی سے یہ معنی نہیں پہنائے تھے۔ (عظیم المیہ ص ۱)۔ پاکستان، مشرقی پاکستان کے

> باشندوں پر جبراً مسلط نہیں کیا گیا تھا۔ ان تمام صوبوں نے جن کے مجموعہ کا نام پاکستان ہے رضاکارانہ طور پر ایک آزاد مملکت کے قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ (ص۵۲)۔ مشرقی پاکستان، پاکستان کا اٹوٹ انگ ہے۔ (ص۹۹)

پھر انہوں نے، ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو 'صدرِ مملکتِ پاکستان کی حیثیت سے'، قوم کے نام اپنی پہلی نشر شدہ تقریر میں کہا کہ:

> مشرقی پاکستان، پاکستان کا ایسا حصہ ہے جو نہ کبھی الگ ہو سکتا ہے نہ تحلیل۔
>
> (طلوع اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی، مملکت پاکستان کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت ہے اور جس جس نے اس بغاوت میں حصہ لیا ہے وہ برابر کے مجرم ہیں۔ لیکن کس قدر مقام تاسف ہے کہ یہاں اس سلسلے میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں۔

میں ان میں سے صرف ایک آواز بطور مثال آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ اور وہ آواز ہے بلوچستان کے موجودہ گورنر، سردار اکبر بگٹی کی جنہوں نے ابتدائے ۱۹۷۲ء میں، ایک پریس کانفرنس میں فرمایا کہ:

> بنگلہ دیش تسلیم کئے جانے کی پنجاب کے سوا کسی اور صوبے کی طرف سے مخالفت نہیں کی جائے گی۔ پنجاب سے بھی صرف اس لئے کہ وہاں بھارت کے خلاف نفرت پھیلائی گئی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھی اور اب بھی۔ جنگ میں صرف پنجاب متاثر ہوا ہے۔ فتح اور شکست صرف پنجاب کی ہوئی ہے۔ حالیہ جنگ بھی صرف پنجاب کی جنگ تھی۔ (طلوع اسلام۔ مارچ ۱۹۷۲ء)

کیا آپ کو اقوام عالم کی تاریخ میں اس قسم کی بغاوت اور اس کی حمایت کی کوئی مثال بھی ملتی ہے؟

مغربی پاکستان میں علیحدگی کے رجحانات

محترم بھٹو نے یہ کہا تھا کہ اگر مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا تو اس کے بعد مغربی پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی باری آ جائے گی۔ ان کا یہ قیاس صحیح نکلا اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد، ان تحریکوں نے سر ابھارنا شروع کر دیا جو اس سے پہلے اس جرأت اور بے باکی کے ساتھ سامنے نہیں آتی تھیں۔ پہلے یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں، چار قومیتیں بستی ہیں، پھر یہ کہا گیا کہ ان میں سے ہر قوم کو حقِ خود ارادیت حاصل ہے۔ اسمیں سندھ نے مسابقت کی اور مسٹر جی۔ ایم سید نے علانیہ کہہ دیا کہ ان کی تحریک کا نصب العین آزاد سندھو دیش ہے۔ طریق کار ان کا وہی ہے جو مجیب نے اختیار کیا تھا۔ اوائل ۱۹۷۲ء میں مسٹر سید کی سالگرہ کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے ایک طالب علم لیڈر اقبال ترین نے کہا تھا:

> سندھو دیش قائم ہو کر رہے گا اور جو لوگ اس راہ میں مداخلت کریں گے ان کے خون سے دریائے سندھ سرخ ہو جائے گا اور سندھ کے گلی کوچے اور بازار لاشوں سے پٹ جائیں گے۔
>
> (طلوع اسلام۔ مارچ ۱۹۷۲ء)

اسی زمانے میں پیپلز پارٹی کے مقامی رہنما احمد نواز اعوان نے یہ انکشاف کیا کہ نیشنل عوامی پارٹی سندھ کے آرگنائزنگ سیکرٹری، جام ساقی نے کچھ عرصہ قبل، بھارت اور دیگر ممالک کی حکومتوں کو محضرنامہ بھیجا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پاکستانی فوج، سندھ کے لوگوں پر مظالم کر رہی ہے، ہماری مدد کو پہنچئے۔ مسٹر اعوان نے بتایا کہ اس محضرنامہ پر بیس افراد کے دستخط ثبت تھے۔ مسٹر سید نے ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو ایک تقریب کے دوران ایک سوال کے جواب میں یہاں تک کہہ دیا کہ:

> اگر موجودہ حکومت برقرار رہی تو سندھو دیش دو سال کے اندر قائم ہو جائے گا۔ انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ کہا کہ اگر بھٹو کی حکومت قائم رہی تو پاکستان ۳۱ مارچ ۱۹۷۵ء تک ختم ہو جائے گا۔ بھٹو صاحب ہمارے مقاصد پورے کر رہے ہیں۔ بنگال کی آزادی بھٹو صاحب کے اُدھر تم اور اِدھر ہم کے اعلان اور اسمبلی کے بائیکاٹ سے ہوئی۔ اب بھٹو صاحب بلوچستان میں بھی وہی حالات پیدا کر رہے ہیں اور بھٹو صاحب کی وجہ سے اب ہمارا کام بہت آسان ہو گیا ہے۔
>
> (ہفت روزہ "زندگی"۔ ۸ تا ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء)

اس تحریک کے استیصال کے لئے حکومت نے کیا کیا اقدامات کئے، قوم کو اس سے زیادہ کچھ علم نہیں کہ مسٹر سید کو نظربند کر دیا گیا۔ نظربندی کی حالت میں بھی مسٹر سید کی سرگرمیوں کی کیا کیفیت ہوتی ہے اس کے لئے پاکستان مسلم لیگ (قیوم گروپ) کے سیکرٹری جنرل (سید ضیا عباس) نے کہا تھا کہ "مسٹر جی۔ ایم سید اپنی نظربندی کے زمانے میں بھی بمبئی کے ہندوؤں سے مل کر سندھو دیش کی تحریک چلاتے تھے"۔ (طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۷۲ء) ہم نہیں کہہ سکتے کہ حالیہ نظربندی میں مسٹر سید کی خفیہ سرگرمیوں کی کیا کیفیت ہے۔ ان سازشوں کے سلسلے میں اربابِ اقتدار کی طرف سے جو کچھ قوم کے سامنے آتا ہے، وہ حیرت انگیز ہی نہیں، بعض اوقات عبرت خیز بھی ہوتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ خان ولی خان نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو پشاور میں ایک تقریر کرتے ہوئے مبینہ طور پر کہا تھا کہ:

> اگر پاکستان کو مزید کوئی نقصان پہنچا تو ہم خسارے میں نہیں رہیں گے بلکہ ہمیں صرف یہ فرق پڑے گا کہ ہماری سرحد طورخم سے اٹک کے پل تک منتقل ہو جائے گی۔
>
> (امروز، لاہور، بابت ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۳ء)

اس کے جواب میں مرکزی وزیرِ قانون مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے چوبیس اکتوبر کو راولپنڈی کی ایک تقریب میں کہا کہ:

> اگر ولی خان نے آئندہ ایسی باتیں کیں تو انہیں کچل دیا جائے گا۔
>
> (نوائے وقت، ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۳ء)

گویا پہلی بار کی اس قسم کی بغاوت خیز تقریر قابلِ مواخذہ نہیں ہوتی۔ جب اسے دہرایا جائے تو پھر یہ اس قابل ہوتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے!

اور خان ولی خان نے پیرزادہ صاحب کے اس ارشاد کے ایک ہی ہفتہ بعد، چارسدہ میں نمازِ عید کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے اپنی سابقہ تقریر کو دہرا دیا اور اس میں اتنا اضافہ بھی کر دیا کہ "طورخم کی سرحد اٹک پل تک نہیں،

بلکہ راولپنڈی کے نزدیک، مارگلہ تک ہوگی۔" انہوں نے سرحد کے گورنر اور وزیر اعلیٰ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انہیں خبردار کیا کہ وہ مشرقی پاکستان کے سابق گورنر ڈاکٹر مالک اور ان کے ساتھیوں کا حشر یاد رکھیں۔ (روزنامہ جمہور ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء)

روزنامہ نوائے وقت کی ۲ نومبر ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں خان ولی خان کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جو انہوں نے اپنی پشاور کی تقریر کے بعد اور عید کی تقریر سے پہلے دیا تھا۔ اس میں، انہوں نے اپنی پشاور کی تقریر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

> میں نے اس سلسلے میں یہ کہا تھا کہ بھٹو صاحب پاکستان کو خراب کرنا چاہتے ہیں اور اسے بچانے کے لئے، سرحد، سندھ، پنجاب اور بلوچستان کو مل کر جدوجہد کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر سندھ اور پنجاب نے ہمارا ساتھ نہ دیا تو پھر آپ غور کریں کہ تکلیف کس کو ہوگی اور نقصان کس کو پہنچے گا۔ پنجاب پر کوئی رنجیت سنگھ قبضہ کرلے گا اور سندھ کسی شیواجی کے قبضے میں چلا جائے گا۔ ہمارے گرد پھر بھی مسلمان پڑے ہیں اس سے ہمیں اتنی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہمارے لئے پھر بھی راہ فرار موجود ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ طورخم کی زنجیر اٹک پل پر لگ جائے گی۔ لیکن کوئی شیواجی یا رنجیت سنگھ ہمیں اپنا غلام نہیں بنا سکے گا۔

میں اس مقام پر آپ کی توجہ جن سنگھ کے سابق صدر پروفیسر بلراج مدہوک کے اُس انٹرویو کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کا اقتباس میں نے پہلے پیش کیا ہے۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:

> میری سیاسی پیشن گوئی یہ ہے کہ پاکستان دنیا کے نقشے سے ختم ہو جائے گا۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے پختونستان کو افغانستان میں ملنا ہے۔ بلوچستان، ایران کے ساتھ جائے گا۔ اب رہا سندھ اور پنجاب۔ بنگلہ دیش تو بن ہی چکا ہے۔ پنجاب ہندوستان سے مل جائے گا اور اسطرح ہندو پنجابی اور مسلمان پنجابی باہم گلے مل جائیں گے۔

ضمناً میں، محترم ولی خان صاحب کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ اگر پنجاب پر کسی رنجیت سنگھ نے قبضہ کر لیا تو وہ راولپنڈی یا اٹک کے اِسطرف تک قناعت نہیں کرے گا۔ آگے بھی بڑھیگا۔ کیا آپ اپنی تاریخ کو اتنی جلدی بھول گئے کہ جب رنجیت سنگھ نے پنجاب پر حکومت کی تھی تو اس کی سرحدیں جمرود تک جا پہنچی تھیں اور ہری سنگھ نلوہ نے جو کچھ اس علاقہ میں کیا تھا اس کی یاد سے آج بھی وہاں کی چٹانیں کپکپا اٹھتی ہیں۔

باقی رہا یہ کہ آپ بہرحال مسلمانوں کی محکومی میں جائینگے تو آپ کا مایۂ ناز شاعر خوشحال خان خٹک ساری عمر مغلوں کی محکومی کے خلاف نبرد آزما رہا۔ اگر مسلمانوں کی محکومی ایسی ہی خوش آئند چیز ہے تو اس کی یہ مخالفت کیوں تھی؟

اور اگر آپ مسلمانوں کی محکومی کو قابلِ اعتراض نہیں سمجھتے تو پھر پاکستان کی موجودہ حکومت کے خلاف آپ کیوں متحدہ محاذ بنائے بیٹھے ہیں۔ کیا یہ مسلمانوں کی حکومت نہیں۔

بات صاف کیوں نہیں کہتے کہ جذبہ سارا نسل پرستی کا ہے۔ آپ افغانوں کو غیر افغانوں پر ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ افغان، افغانستان ہی کے کیوں نہ ہوں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ اسلام اور نسلی تفریق یکجا نہیں ہو سکتے۔

محترم! آپ کو اگر کوئی شکایت ہے تو اس کے خلاف اسلام کو آواز دیجئے، کہ وہی 'مسلمان' کہلانے والوں کا ملجا و ماویٰ ہے۔

* * *

اعمالنامہ

میں عزیزانِ گرامی قدر! اس دلخراش، جگر سوز، خوں فشاں داستاں کو طول نہیں دینا چاہتا۔ یہ داستان نہ تو خارج سے کسی کی لکھی ہوئی ہے اور نہ ہی شبا شب مرتب ہو گئی ہے یہ خود ہمارے اپنے ہی ہاتھوں کی مرتب کردہ ہے اور گذشتہ چھبیس سال سے برابر لکھی جا رہی ہے۔ میں نے اسی جہت سے اس کا عنوان، اعمالنامہ، تجویز کیا ہے۔ اعمالنامہ کے متعلق، قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَ كُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ۔ یہ کہیں خارج میں ملفوف نہیں ہوتا۔ یہ ہر انسان کے گلے میں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ یہ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا۔ پہلے یہ لپٹا ہوا ہوتا ہے اور یوم مکافات کو اسے کھول کر سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور اس شخص سے کہا جاتا ہے کہ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ۔ تو اپنا اعمالنامہ خود آپ ہی پڑھ لے كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔ (۱۷/۱۳-۱۴) اسے پڑھ بھی خود ہی لے اور پھر اپنا حساب بھی خود ہی کر لے کہ اس کے لئے کسی اور محاسب کی ضرورت نہیں۔

ہمارا یہ اعمالنامہ، چھبیس سال سے مرتب ہوتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے آج اسے آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔ اسے خود ہی پڑھ لیجئے اور خود ہی اس کا فیصلہ کر لیجئے کہ ہمارا انجام کیا ہوگا۔ کہنے کو تو بڑی آسانی سے کہہ دیا جا سکتا ہے کہ افغانستان کی سرحد، راولپنڈی تک پہنچ آئے گی۔ سندھ، بمبئی کے ساتھ مل جائے گا، پنجاب مغربی بھارت میں ضم ہو جائے گا لیکن ایسے وقت میں قوموں کا جو حشر ہوتا ہے، اس کی مثال محشرستان مشرقی بنگال کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ قوم کی جان۔ مال، عزت، آبرو، عفت، عصمت، میں سے کوئی متاع بھی محفوظ نہیں رہا کرتی۔ یہ تو اِس قسم کے ادغام کا ہنگامی حادثہ ہوتا ہے اور اس کے بعد مستقل غلامی کی زنجیریں جس طرح ہڈیاں توڑتی ہیں، اس کے تصور سے روح کپکپا اٹھتی ہے۔ ہماری قوم کی بے حسی سے کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ہم اس مقام پہ پہنچ چکے ہیں جس کا نقشہ غالب نے اپنے جگر پاش طنزیہ انداز میں اپنے ایک خط میں کھینچا تھا۔ اس سے کسی غمخوار نے پوچھا تھا کہ دلی میں جو قیامتیں گذر رہی ہیں انہیں آپ کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔ اس کے جواب میں غالب نے لکھا تھا کہ میں نے ان تمام مصیبتوں کو بڑا آسان بنا دیا ہے۔ وہ اس طرح کہ میں نے غالب کو اپنے سے غیر فرض کر لیا ہے، جب کوئی نئی مصیبت آتی ہے تو میں یہ کہہ کر خوش ہو لیتا ہوں کہ اچھا ہوا غالب کے ایک اور چپت لگی۔ عزیزانِ من! مجھے بھی کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ہم نے بھی اپنے آپ کو قوم کا غیر فرض کر لیا ہے۔ اپنے ہولناک مستقبل کا تصور کرتے ہوئے ہم یہ کہہ کر سکھ کی نیند سو جاتے ہیں کہ یہ مصیبتیں پاکستانی قوم پر آئیں گی، ہم پر نہیں۔ عزیزانِ من! یہ مصیبتیں ہم ہی پر آئیں گی۔ ہمارے ہی گھر بار لٹیں گے۔ ہماری ہی جان و مال کا ضیاع ہوگا۔ ہماری ہی عصمتیں برباد ہوں گی۔ ہماری بچیاں، درندوں کے خونخوار پنجوں کا شکار ہوں گی تو وہ حسرت بھری نگاہوں سے ہماری ہی طرف تکیں گی اور ہم بے بسی کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھنے پر مجبور کئے جائیں گے۔ اس وقت کوئی دیوار بھی نہیں ہوگی جس سے

ہم اپنا سر پھوڑ لیں۔ کوئی سمندر بھی نہیں ہوگا جس میں ہم ڈوب کر مر جائیں۔ ہمیں وحشی اور کمینہ قوموں کی غلامی میں بے حمیتی کی زندگی جینا اور بے غیرتی کی موت مرنا ہوگا۔ اس مقام پر ہمارے سامنے بیساختہ وہ سوال آجاتا ہے جو آجکل ہر ایک کی زبان پر ہے۔ اور وہ یہ کہ کیا ان حالات میں پاکستان بچ جائیگا؟ کیا ہماری آزادی قائم رہ جائیگی؟ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ قوموں کی ابدی ہلاکت سے پہلے انہیں فطرت کی طرف سے وارننگ ملتی ہے۔ اگر وہ اس پر بیدار ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان کے بچنے کی صورت ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر ان پر آخری تباہی آجاتی ہے جس کے بعد ان کی صرف کہانیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ابھی وارننگ مل رہی ہے۔ اگر ہم اِسوقت بھی سنبھل گئے تو ہماری نجات کی صورت ہو سکتی ہے۔ اس 'سنبھلنے' کی کیا تدبیر ہو گی' یہ سوال بڑا غور طلب ہے۔ اس کیلئے بنیادی اقدامات تو ارباب اقتدار کیطرف سے ہونے چاہئیں۔ وہ اقدامات کیا ہونے چاہئیں' انہیں وہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے معاملات میں بے طلب اور سرراہے مشورہ دینا مفید نہیں رہتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے میں یہاں صرف ان امور کو سامنے لانا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک، خود ہمارے (یعنی قوم کے) کرنے کے ہیں۔

آپ دیکھیں گے کہ یہاں ہر شخص یہ رونا روتا ہے کہ ملک میں (CORRUPTION) عام ہو رہی ہے۔ لیکن ایسا کہنے والا خود کسقدر (CORRUPT) ہے یا اس (CORRUPTION) کا وہ کس حد تک ذمہ دار ہے' اس کے متعلق نہ کہنے والا کبھی سوچتا ہے' نہ سننے والا اس سے پوچھتا ہے' اور نہ ہی جاننے والا اُسے ٹوکتا ہے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص اپنا محاسبہ شروع کر دے تو ہم دیکھیں گے کہ معاشرہ کسطرح خود بخود پاکیزہ ہو جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ قوم پہلے ہی جذباتی تھی۔ وہ شکست خوردہ عناصر جو اقتدار سے محروم رہ جاتے ہیں اپنی مقصد براری کے لئے اسے اور جذباتی بنا دیتے' اور انہیں ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں میں الجھا دیتے ہیں۔ یہ طریق کار بڑا تخریبی ہے۔ جب ہم نے یہ طریق ۱۹۷۰-۷۱ء میں اختیار کیا تھا تو اسوقت بھارت، ۱۹۶۵ء کی جنگ کا شکست خوردہ تھا' اس لئے اس نے ہمارے خلفشار سے فائدہ اٹھانے کیلئے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ سنہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد اس کے حوصلے بہت دراز ہو چکے ہیں۔ اگر ہم نے اب وہی شکل اختیار کی تو وہ فوراً جھپٹ پڑیگا۔ اسے ہر وقت ذہن میں رکھئے۔ قوم کو فکری راہ نمائی کی ضرورت ہے' اور یہ راہ نمائی انہی ارباب فکر و نظر کی طرف سے مل سکتی ہے جن کے دل میں ہوسِ اقتدار نہ ہو' اس لئے وہ عملی سیاست میں حصہ نہ لیں۔ زیادہ عرصہ کی بات نہیں کہ قوم میں ایسے افراد یہ فریضہ سرانجام دیا کرتے تھے' اور چونکہ انکا کردار بھی بلند ہوتا تھا اس لئے قوم ان کا احترام کرتی تھی اور حکومت بھی ان کے ساتھ شرافت سے پیش آتی تھی۔ آپ علامہ اقبالؒ کے دور کو سامنے لائیے اور دیکھئے کہ اس زمانے میں' پورے ملک میں تو ایک طرف' خود اس شہر لاہور میں' ایسے ارباب فکر و نظر کی کسقدر کثیر تعداد موجود تھی۔ ملک میں اسوقت بھی ایسے افراد کی کمی نہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہنگامہ آرائیوں اور شعلہ خیزیوں نے قوم کی نگاہوں میں لیڈر شپ کا معیار بدل دیا ہے۔ اب ارباب فکر کو بے عمل تصور کیا جاتا اور شریف انسان کو بزدل سمجھا جاتا ہے۔ آپ فکری دیانت اور پاکیزگی سیرت کو لیڈر شپ کا معیار قرار دیجئے اور ایسے ابنائے قوم کا احترام کرنا سیکھئے' پھر دیکھئے کہ آپ کا یہ کارواں' پرسکون اور بے خطر راہوں پر گامزن ہو کر کسطرح شاداں و فرحاں منزل مقصود تک جا پہنچتا ہے۔

قرآن کا یہ پیغام ازلی یاد رکھئے کہ قوموں کی تعمیر فکری اور نفسیاتی تبدیلی سے ہوتی ہے' ہنگاموں سے نہیں۔

بخود نگر گلہ ہائے جہاں چہ می گوئی - اگر نگاہ تو دیگر شود جہاں دگر است

یعنی، تیری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا - عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے۔

والسلام

قرآن مجید میں تحریف

"احمدی" حضرات کی خصوصی توجہ کے لئے

پرویز

حالیہ طلوعِ اسلام کونشن کی مجلس استفسارات میں ایک سوال میرے پاس بھیجا گیا۔ سوال کا جواب تفصیل طلب تھا۔ اور وقت کم تھا اس لئے اس کا جواب اُس مجلس میں نہ دیا جاسکا۔ لیکن سوال کی اہمیت اس کے جواب کی متقاضی ہے سوال یہ تھا۔

> آجکل اخبارات میں تحریفِ قرآن کے متعلق کچھ بحث چل رہی ہے۔ اس میں ایک بات یہ بھی کہی جارہی ہے کہ میرزا صاحب نے قرآن کی ایک آیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ وہ آیت حضرت ابن عباس رضؓ کی قرأت میں اُسی طرح ہے جس طرح میرزا صاحب نے لکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ "حضرت ابن عباس کی قرأت" سے کیا مراد ہے۔ ذرا تفصیل سے سمجھایئے۔

بات توجہ سے سمجھنے کی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر "قرأت" سے مراد، قرآن کریم کے پڑھنے کا انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ "قاری" اُسے کہتے ہیں جو ایک خاص انداز سے قرأت پڑھے۔ لیکن اصطلاح میں "قرأت" کا مفہوم اس سے بالکل الگ ہے۔ قرآن مجید کے متعلق شکوک اور شبہات پیدا کرنے کے لئے جس قدر سازشیں ہوئی ہیں، ان میں "اختلافِ قرأت" ایک اہم کڑی ہے۔

۲۔ اسلام کی صداقت، افضلیت اور اکملیت کا مدار ختمِ نبوت پر ہے اور ختمِ نبوت کا عملی مفہوم یہ ہے کہ:۔

(۱) وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۔ (۶/۱۱۵) یعنی قرآن مجید مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ اللہ تعالےٰ نے دین کے سلسلہ میں جو کچھ انسانوں کو دینا تھا وہ مکمل طور پر قرآن کریم میں دے دیا گیا ہے۔ لہذا، اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔ اور جو کچھ اس میں کہا گیا ہے وہ محکم اور ابدی ہے، اس لئے اس میں کوئی ردّ و بدل نہیں کر سکتا ... اور

(۲) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹) حفاظتِ قرآن کا ذمہ خدا نے خود لے

رکھا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو قرآن، رسول اللہ کو بذریعہ وحی دیا جسے رسول اللہ نے امت تک پہنچایا، اور جو اُس وقت سے اِس وقت تک مروج ہے، وہ مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہے۔ بنا بریں اب خدا کی طرف سے کسی وحی کی ضرورت نہیں۔ اسی کو ختمِ نبوت کہتے ہیں۔ اگر قرآن مجید کی ان تینوں بنیادی خصوصیات میں سے کسی ایک کے متعلق بھی کوئی شک و شبہ پیدا ہو جائے تو دین باقی نہیں رہتا۔

(۳) حضورؐ کو جو قرآن، خدا کی طرف سے عطا ہوا، آپ نے اُسے نہایت احتیاط اور حفاظت سے امت کو دے دیا۔ لکھوا کر بھی اور حفظ یا دکرا کر بھی۔ چنانچہ جو قرآن، امت میں مروج ہے، حضورؐ نے اُسے اسی ترتیب اور شکل میں امت کو دیا تھا۔ یہی قرآن مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہے۔ دین کے خلاف سازشوں کے سلسلہ میں پہلے اس قسم کی روایات وضع کی گئیں کہ رسول اللہؐ نے امت کو قرآن مجید مرتب شکل میں نہیں دیا تھا۔ یہ مختلف اور متفرق کاغذ کے پرزوں، پتھر کے ٹکڑوں، کھجور کے پتوں اور اونٹوں کی ہڈیوں پر منتشر تھا۔ اسے بعد میں جمع اور مرتب کیا گیا۔ — عہد صدیقیؓ، یا فاروقیؓ یا عثمانیؓ میں — (روایات کی رُو سے) جس طریق سے اسے جمع اور مرتب کیا گیا، وہ بجائے خویش، مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موجب ہے (میں اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ موضوع زیرِ نظر کی طرف بڑھ جانا چاہتا ہوں) عام طور پر اس پر اتفاق ہے کہ عہد عثمانیؓ میں جو نسخہ مرتب ہوا تھا، وہ آگے چلا اور وہی اس وقت تک امت میں رائج چلا آ رہا ہے۔ اسی نہج سے اسے مصحفِ عثمانی کہا جاتا ہے۔

(۴) بات یہاں تک بھی رہتی تو کسی حد تک غنیمت تھا، لیکن سازش اس سے بھی آگے بڑھی۔ کہا یہ گیا کہ خود حضرت عثمانؓ کے زمانے میں، مختلف صحابہؓ کے پاس قرآنِ مجید کے ایسے نسخے تھے، جن میں متعدد آیات ایسی تھیں جو مصحفِ عثمانی سے مختلف تھیں۔ اسے "اختلافِ قرأت" کہا جاتا ہے۔ یعنی جب (مثلاً) یہ کہا جائیگا کہ "حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کی قرأت میں یوں آیا ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مصحفِ عثمانی میں تو یہ آیت یوں درج ہے۔ لیکن قرآن کا جو نسخہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس تھا، اس میں یہ آیت یوں تھی۔ اس قسم کے اختلافات، دو، چار، دس آیات تک محدود نہیں۔ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ حدیث کے مشہور امام اور جامع، ابو داؤد کے صاحبزادہ حافظ ابوبکر عبد اللہ سجستانی (متوفی ۳۱۶ھ) کی ایک مشہور تالیف ہے — کتاب المصاحف — اس میں انہوں نے قرآن کی جمع اور تدوین سے متعلق روایات بھی یکجا درج کی ہیں اور صحابہؓ اور تابعینؒ کے مختلف نسخوں (مصاحف) کا بھی ذکر کیا ہے۔ (معاذین کو ایسا مسالہ خدا دے۔ چنانچہ) ایک مستشرق (ARTHUR JEFFERY) نے اس کتاب کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اور اس میں ان مصاحف کی تفصیل بھی درج ہے جو مختلف صحابہؓ اور تابعینؒ کی طرف منسوب ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ان مصاحف کی ان آیات کو بھی درج کیا ہے جو مصحفِ عثمانی سے مختلف ہیں۔ ان میں صرف صحابہؓ کی طرف منسوب مصاحف حسبِ ذیل ہیں۔ ہم نے قوسین میں اُن آیات کی تعداد لکھ دی ہے جو، ان میں مصحفِ عثمانی سے مختلف ہیں۔ مثلاً ابن مسعود (۱۳۲۲) سے مراد یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی طرف منسوب مصحف میں (۱۳۲۲) آیات ایسی تھیں جو مصحفِ عثمانی (یعنی ہمارے

؎ اس کی تفصیل ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب — مقامِ حدیث — میں ملے گی۔

مروجہ قرآن مجید) سے مختلف تھیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) حضرت ابن مسعودؓ (۱۳۲۲)۔ (۲) حضرت ابی بن کعبؓ (۹۵۲)۔ (۳) حضرت علیؓ۔ (۸۹)
(۴) حضرت ابن عباسؓ (۱۸۶)۔ (۵) حضرت ابوموسیٰؓ (۴)۔ (۶) حضرت حفصہؓ (۱۰)۔ (۷) حضرت
انس بن مالکؓ (۲۳)۔ (۸) حضرت عمرؓ (۲۸)۔ (۹) حضرت زید بن ثابت (۱۰)۔ (۱۰) حضرت
ابن زبیرؓ (۴۳)۔ (۱۱) حضرت عمر ابن العاصؓ (تعداد معلوم نہیں)، (۱۲) حضرت عائشہؓ (۱۳)
(۱۳) حضرت سالمؓ (۲)۔ (۱۴) حضرت ام سلمہؓ (۴)۔ (۱۵) حضرت عبید ابن عمیرؓ (۱۸)

تابعینؒ کی طرف منسوب مصاحف نیز ایسے مصاحف جو بے نام ہیں' ان کی تعداد الگ ہے۔ ان اختلافات کی یہ نوعیت نہیں کہ ان میں محض زیر، زبر کا فرق ہے۔ (اگرچہ عربی زبان میں زیر، زبر کے فرق سے بھی بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے) ان میں' الفاظ تک بدلے ہوئے ہیں۔ کہیں الفاظ کا اضافہ ہے۔ کہیں وہ محذوف ہیں۔ کہیں تبدیل شدہ ایسے الفاظ جن سے معانی کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔

آپ سوچئے کہ جب قرآن کریم کے متعلق یہ عقیدہ ہو کہ صحابہؓ کے زمانے میں بھی' مختلف صحابہؓ کے نسخوں میں اختلاف تھا' اور جو نسخہ مستند طور پر امت کو دیا گیا تھا (مصحفِ عثمانی) خود اس میں' اور ان نسخوں میں سینکڑوں مقامات میں اختلاف تھا' تو قرآن کے دعوئے اکملیت' محکمیت (غیر متبدل) اور محفوظ ہونے کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ ہمارے علماء کرام ان "مختلف قراؑتوں" کے قائل ہیں۔ چنانچہ آپ نے اکثر ان حضرات کو کہتے سنا (یا لکھتے دیکھا) ہو گا کہ قرآن مجید کی آیت یوں ہے لیکن حضرت ...... کی قراءت میں یوں آیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا تھا کہ

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۔ (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔

یعنی قرآن نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ آپ سوچئے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ فلاں آیت ایک مصحف میں یوں آئی ہے اور دوسرے میں یوں' تو قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ باقی رہ سکتا ہے؟ اس عقیدہ سے دین کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔ یہ ہے وہ سازش جو قرآن (یا دین) کے خلاف کی گئی۔!

~~~~~~(۶)~~~~~~

اس تمہید کے بعد اس سوال کی طرف آیئے جسے شروع میں درج کیا گیا ہے۔ سورۂ حج کی ایک آیت ہے۔

(۱) وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۔ (۲۲/۵۲)
~~~~~~

> (وحی کا سلسلہ ایسا رہا ہے کہ) کوئی رسول اور نبی ایسا نہیں آیا جس (کے بعد اس) کی وحی میں، دین کے دشمنوں (شیاطین) نے آمیزش نہ کر دی ہو۔ (جب ایسی تحریف ہو جاتی تھی تو خدا ایک اور رسول بھیجدیتا تھا اور اس کی طرف نازل کردہ وحی کے ذریعے) اس آمیزشِ شیطانی کو منسوخ کر کے، خالص وحی کو پھر محکم کر دیتا تھا۔ اور یہ سب کچھ خدا کے علم و حکمت کی بنا پر ہوتا تھا۔[1]

مرزا غلام احمد نے اپنی کتاب براہینِ احمدیہ میں (جو غالباً ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے) کہا ہے کہ انہوں نے رسالت یا نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ انہوں نے محدّث ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس کی سند میں کہا ہے کہ محدثین کا ذکر خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ (معترضین نے کہا کہ) مرزا صاحب نے اپنے اس دعویٰ کی ثبوت میں قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیت کو اس طرح پیش کیا ہے۔

(۲) وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ وَّ لَا مُحَدَّثٍ اِلَّا ....

یعنی مرزا صاحب نے قرآن کریم کی آیت میں لفظ محدّث کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیا ہے۔ یہ قرآن میں تحریف ہے اور جس دعویٰ کی بنیاد تحریفِ قرآنی پر ہو اس کے باطل ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ مرزا صاحب کے متبعین کی لاہوری شاخ کے ترجمان۔ پیغام صلح ۔۔۔ کی ۱۴ر نومبر ۷۲ء کی اشاعت میں اس اعتراض کے جواب میں کہا گیا ہے۔

> مصنف کتابچہ نے اس عبارت سے پیشتر یہ الفاظ حذف کر دیئے ہیں۔ "آپ کو معلوم ہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ کی قرأت میں آیا ہے" حضرت مرزا صاحب حضرت ابن عباس رضؓ کی قرأت درج کر رہے ہیں اور فاضل مصنف اُسے آیتِ قرآنیہ قرار دے کر اور سیاق و سباق کو حذف کر کے اشتعال انگیزی میں مصروف ہیں تاکہ نانِ جویں تو میسّر آسکے۔ یاد رہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ کی قرأت درج کر کے حضرت مرزا صاحب بھی یہی ثابت کر رہے ہیں کہ میرا منصب مُلہم و محدث کا ہے نہ کہ نبوت کا، جیسا کہ غالی مریدوں اور مخالفوں کا پروپیگنڈا ہے۔

میرزا صاحب نے براہینِ احمدیہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

> آپ لوگ کیوں قرآن شریف میں غور نہیں کرتے اور کیوں سوچنے کے وقت غلطی کھا جاتے ہیں۔ کیا آپ صاحبوں کو خبر نہیں کہ صحیحین سے ثابت ہے کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) اس امت کے لئے بشارت دے چکے ہیں کہ اس امت میں بھی پہلی امتوں کی طرح محدث پیدا ہوں گے۔ اور محدث بفتح دال وہ لوگ ہوں گے جن سے مکالمات و مخاطبات الٰہیہ ہوتے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ابن عباس کی قرأت میں آیا ہے۔ وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ وَّ لَا مُحَدَّثٍ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰى

---

[1] ہمارے مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ کیا کیا ہے، اور تفسیری روایات نے اس میں کیا گل کھلائے ہیں، ہم اس وقت ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ ہم سردست اپنے آپ کو موضوع زیر نظر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ[1] پس اس آیت کے رو سے بھی جس کو بخاری نے بھی لکھا ہے، محدّث کا الہام یقینی اور قطعی ثابت ہوتا ہے جس میں دخل شیطان کا قائم نہیں رہ سکتا۔

(براہین احمدیہ۔ شائع کردہ۔ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام۔ لاہور
سنہ ۱۹۵۰ء۔ آٹھواں ایڈیشن، صفحہ ۳۴۸، حاشیہ در حاشیہ)

آپ ان الفاظ کو غور سے پڑھیے۔ میرزا صاحب پہلے کہتے ہیں کہ "ابن عباس کی قرأت میں آیا ہے۔" اور اس کے بعد لکھتے ہیں۔ "اس آیت کی رو سے بھی جسے بخاری نے بھی لکھا ہے، محدث کا الہام یقینی اور قطعی ثابت ہوتا ہے۔" بالفاظ دیگر، وہ قرأت حضرت ابن عباس کی آیت کو "آیت" کہہ کر پکارتے ہیں (جس کے معنی لامحالہ آیت قرآنی ہیں) اور اس آیت کو اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ "محدّث کا الہام قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔" (واضح رہے کہ لفظ مُحَدَّث سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا)۔

اس ضمن میں ہم "احمدی" حضرات سے حسب ذیل سوالات متعین طور پر پوچھنا چاہتے ہیں۔

(۱) کیا ان کے عقیدے کی رو سے اللہ تعالیٰ نے جو آیت بذریعہ وحی رسول اللہؐ پر نازل کی تھی وہ اس طرح تھی جس طرح ہمارے مروجہ قرآنی نسخوں میں درج ہے (یعنی (۱) کی طرح) یا اس طرح جیسے قرأت حضرت ابن عباس میں بتائی جاتی ہے۔ (یعنی (۲) کی طرح۔ لفظ محدّث کے اضافہ کے ساتھ)

(۲) اگر وہ آیت اس طرح تھی جس طرح مروجہ قرآنی نسخوں میں درج ہے (لفظ محدث کے بغیر) تو جس آیت میں لفظ محدث کا اضافہ ہو، اسے آپ کیا قرار دیں گے؟ کیا آپ اسے قرآن میں تحریف قرار دینگے؟ یا نہیں، کیونکہ اضافہ بھی تو تحریف ہوتا ہے۔

(۳) اگر آپ اسے قرآن میں تحریف قرار دیں گے تو جو شخص اپنے کسی دعویٰ کی تائید میں اس قسم کی محرف آیت کو پیش کرے، اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے!

(۴) اور اگر آپ کہیں کہ آپ دونوں آیتوں کو منزل من اللہ مانتے ہیں، تو پھر قرآن کریم کے اس دعوے کے متعلق آپ کیا کہیں گے کہ اس کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۵) آپ دنیا کے سامنے "منزل من اللہ قرآن شریف" کون سا پیش کرتے ہیں؟ وہی جو مسلمانوں میں مروج ہے یا دیگر قرأتوں والا؟ اگر وہی پیش کرتے ہیں تو دوسری قرأتوں والے مصاحف کی آپ کے نزدیک کیا حیثیت ہے؟

ہم "احمدی" حضرات سے گزارش کریں گے (خواہ وہ قادیانی ہوں یا لاہوری) کہ وہ ان سوالات کے دوٹوک اور متعین جوابات مرحمت فرمائیں۔ اس قسم کا جواب کہ "اس باب میں جو عقیدہ جمہور مسلمانوں کا ہے

---

[1] میرزا صاحب نے یہاں آیت کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن اپنے اشتہار میں اس کا حوالہ (انبیاء — ۲۱ : ۲۵) لکھا ہے جو غلط ہے۔ قرآنی آیت کا حوالہ سورۃ الحج۔ آیت ۵۲ ہے۔ (ب ح)

وہی ہمارا عقیدہ ہے۔" قابلِ تسلیم نہیں ہو گا۔ بات آپ کے مقتدا نے کی ہے اس لئے اس کا جواب آپ کے ذمے ہے۔ آپ اپنا متعین جواب لکھئے۔ (خواہ وہ جمہور مسلمانوں کے مطابق ہو یا اس کے خلاف) آپ کا جواب موصول ہونے پر بات آگے چل سکے گی۔

* * *

آخر میں ایک ضروری وضاحت۔ میں نے اپنی تازہ تصنیف — شاہکارِ رسالت — میں مرزا صاحب کے دعوٰیٔ محدثیت کا ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۵۲۶) اُس وقت براہینِ احمدیہ کا نسخہ میرے پیشِ نظر نہیں تھا اس لئے میں نے حوالہ پر اکتفا کیا تھا۔ اُس کتاب کے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ براہینِ احمدیہ کا مندرجہ بالا حوالہ نوٹ کر لیں۔ مرزا صاحب کے دعوے کے متعلق حالیہ بحث بھی یقیناً ان کے لئے موجبِ دلچسپی ہو گی۔

(پرویز)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں ہر اتوار۔ صبح ۹½ بجے بمقام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور ٹیلیفون نمبر ۸۰۸۰۰	**لائل پور میں** بروز جمعہ۔ (بذریعہ ٹیپ) ۳½ بجے (بعد نماز جمعہ) بمقام:۔ دفتر بزم طلوعِ اسلام۔ راجہ چوک ریل بازار رابطہ کے لئے ٹیلیفون نمبر ۲۴۹۴	**ملتان میں** بروز جمعہ۔ (بذریعہ ٹیپ) بعد از نماز جمعہ بمقام:۔ دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ ملتان ٹیلیفون نمبر ۲۰۷۱
سیالکوٹ میں ہر اتوار۔ صبح ۹½ بجے (بذریعہ ٹیپ) بمقام۔ چوہدری محمد دین۔ ٹی سٹال کرسچن ٹاؤن سیالکوٹ ۲	**کراچی میں** ہر اتوار۔ صبح ۹½ بجے (بذریعہ ٹیپ) بمقام:۔ دفتر بزم طلوعِ اسلام۔ ۲/۱ فردوس مارکیٹ۔ (بالمقابل بس سٹاپ) پہلی چورنگی۔ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸۔ ٹیلیفون نمبر ۶۱۰۴۶۸	

طلوع اسلام نہ ملنے کی شکایت شکایت موصول ہونے پر پندرہ تاریخ تک پرچہ دوبارہ ارسال کیا جا سکے گا۔ اس کے بعد اطلاع آنے پر (اگر موجود ہوا تو) قیمتاً بھیجا جائے گا۔ خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضروری ہے۔

(ناظم ادارہ)

عیدِ آزاداں ـــــ عیدِ محکوماں

نومبر ۱۹۶۳ء کے رسالہ میں عنوانِ بالا پر پرویز صاحب کی ایک تقریر شائع ہوئی تھی جسے انہوں نے ۱۹۴۸ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کیا تھا۔ اس میں دو اور اسی قسم کی تقریروں کا ذکر بھی آیا تھا جنہیں عدمِ گنجائش کی بنا پر اس وقت شائع نہیں کیا جا سکا تھا۔ ان تقاریر کی اہمیت کے پیشِ نظر انہیں اب شائع کیا جاتا ہے۔

دوسری تقریر

(۲) روزوں کی عید قرآن کریم کے نزول کی سالگرہ منانے کا وہ جشنِ مقدس جس کی ابتدا رمضان المبارک کے چاند سے ہوئی تھی آج اس کا آخری دن ہے۔ جس طرح اس تیوہار کی تقریب نرالی ہے اسی طرح اس کے منانے کا انداز بھی انوکھا ہے۔ جشن و مسرت کے تیوہار عام طور پر کسی انسان کی یادگار قائم رکھنے یا کسی تاریخی واقعہ کو محفوظ کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ انسانوں کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں اور دنیاوی واقعات بھلائے جا سکتے ہیں پر خدا کا وہ پیغام جو قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے کبھی مٹ نہیں سکتا کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اس نے لی ہے جو زندہ ہے اور کبھی مر نہیں سکتا۔ ایسا قائم ہے کہ اسے کبھی فنا اور زوال نہیں۔ یہ جشنِ عید اسی خدائے حی و قیوم کی زندہ و پائندہ کتاب کے نزول کی یادگار ہے اور جب تک دنیا باقی رہے گی یہ یادگار بھی باقی رہے گی۔ دنیا کے بڑے بڑے مورخ اس پر شاہد ہیں کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے مسلمانوں کو ملا تھا اس میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہ اس سے پہلے ہوا ہے نہ اس کے بعد ہوگا۔ کہ جس کا محافظ خود اللہ ہو، اس میں کون ردوبدل کر سکتا ہے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ۔ واللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ و للہ الحمد۔

پھر اسے بھی دیکھئے کہ دنیا کے جشن عام طور پر کھیل، تماشا، راگ رنگ، عیش و نشاط سے منائے جاتے ہیں لیکن شعائرِ الٰہی کی یادگار کے جشن منانے کے لئے ایک جداگانہ پروگرام تجویز کیا گیا ہے اس کے لئے مہینہ بھر سے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ اسلام کے معنی خدا کی اطاعت کے ہیں۔ زبردستی اطاعت نہیں بلکہ دل کی خوشی سے برضا و رغبت اطاعت۔ یہ اسی کی اطاعت ہے کہ ایک عبدِ مومن حرام اور ناجائز شے کو چھو نہیں سکتا۔ اس کے ہاتھوں کسی شخص کے مال، جان، آبرو کو ناحق کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اسی جذبۂ اطاعت کی تقویت کیلئے حکم دیا گیا کہ اس کے حکم کے ماتحت کچھ وقت کیلئے حلال اور طیب چیزوں کو بھی چھوڑ دیا جائے تاکہ حرام اور ناجائز کی طرف کبھی نگاہ بھی نہ اٹھنے پائے۔ انہیں دن بھر بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرنے کا خوگر بنایا گیا، تاکہ یہ جہادِ زندگی کے سخت ترین مرحلوں سے ہنستے کھیلتے گذر جانے کے عادی ہو جائیں۔ انہیں راتوں کو مساجد میں جمع کیا گیا کہ قانونِ خداوندی کا وہ ضابطہ جس کے ماتحت انہیں زندگی بسر کرنا ہے پورے کا پورا مسلسل ذہن نشین ہوتا چلا جائے۔ گویا یہ ایک سالانہ ٹریننگ کیمپ تھا جس میں زندگی میں تازہ ولولے پیدا کرنے کے سامان فراہم کئے گئے تھے۔ ایک یادداشت تازہ کرنے والا (REFRESHER COURSE) تھا جس میں خدا اور بندے کے براہِ راست تعلقات کی یاد تازہ کی گئی تھی۔ سالانہ محاسبہ (STOCK TAKING) تھا جس میں سال بھر کے اعمال اور نتائج کی جانچ پڑتال کر کے جائزہ لینا تھا کہ ہم ایک سال میں کس حد تک آگے بڑھتے ہیں۔ جب پورے ایک ماہ کی محنت اور اطاعت کے بعد دلوں میں تزکیہ، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا اور روح میں بالیدگی پیدا ہو گئی تو ان تمام کو یکجا جمع ہونے کا حکم

[redacted]

دیا گیا تاکہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ انہیں اس زندگی کے حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ کرنا ہے جو جماعتِ مومنین کی خصوصیت ہے اور جس کے وعدے قرآن کریم کے ایک ایک صفحہ پر سچے موتیوں کی طرح ابھرے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اس سوچ بچار کے بعد اپنے لئے ایک پروگرام تیار کریں جس کا اعلان ان کا منتخب امام اپنے خطبہ میں کرے۔ اس کے بعد ان کے نمائندے اس طے شدہ پروگرام کو لیکر ملتِ اسلامیہ کے مرکزِ محسوس یعنی بیت اللہ شریف کی طرف روانہ ہو جائیں جہاں ان مختلف مقامی پروگراموں کی روشنی میں تمام ملت کیلئے مشترکہ نظام تجویز کیا جائے۔ یہ ہیں جشنِ مسرت کے مختلف اجزاء اور یہ ہے ان اجزا کی اجمالی تفصیل۔ انہیں سامنے رکھیئے اور پھر دیکھئے کہ یہی تقریبیں جن کے ہر گوشۂ بساط پر کبھی زندہ آرزوئیں مچلتیں اور تازہ ولولے رقص کرتے تھے۔ اصلی روح کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے پر کس طرح رفتہ رفتہ رسمی اجتماعوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ بقول حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج ! یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

آپ عید گاہ میں پہنچیں گے تو آپ کو نماز کے مسائل سمجھائے جائیں گے۔ بتایا جائیگا کہ صفیں کس طرح سیدھی رکھنی چاہئیں، دونوں پاؤں کے درمیان فاصلہ کتنا ہونا چاہئیے۔ کندھے کے ساتھ کندھا کس طرح ملانا چاہئیے۔ ہاتھ کس طرح باندھنے اور کہانتک اٹھانے چاہئیں، تکبیریں کس طرح کہنی چاہئیں۔ یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں اور ان کی پابندی لازمی لیکن ان ظاہرا ارکان کی پابندی کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی تو ضروری ہے کہ آپ وہاں جمع کس غرض کے لئے ہوئے ہیں۔ نماز آپ کو کیا پیغامِ حیات دیتی ہے۔ جماعت کے ساتھ ملنا کیوں ضروری ہے، جماعت ایک ہی کیوں ہوتی ہے۔ متعدد کیوں نہیں ہو سکتیں۔ امام بھی ایک ہی کیوں ہوتا ہے اور اس کی ایک آواز پر بلا چون وچرا سب کو ایک ہی حرکت کیوں کرنی پڑتی ہے۔ اس سے کہیں بھول چوک ہو جائے تو اسکی اطاعت سے کیوں سرتابی نہیں کی جاتی اور اس کے لئے بھی جہانتک ممکن ہو غلطی سے بچنا کس قدر ضروری ہے کہ اس کے سہو کا کفارہ پوری جماعت کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ جھکنا کیا ہے، یہ اٹھنا کیسا ہے، کس طرح

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

وحدتِ افکار و کردار، یعنی خیالات میں یکسانیت اور اعمال میں یک رنگی، قوموں کی زندگی کے یہی بنیادی اصول ہیں اور ان چیزوں کے حاصل کرنے کے لئے تمام قومیں مختلف قسم کی جدوجہد کرتی ہیں۔ لیکن اسلام میں یہ سب کچھ از خود موجود ہے۔ اور موجود ہے اس للّٰہیت کو لئے ہوئے جو مسلمانوں کا امتیازی نشان ہے لیکن آج مسلمانوں میں افکار اور اعمال کی وحدت کی جو کمی نظر آتی ہے اسکی وجہ اسکے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی

ہمارے ان مناسک اور شعائر کی شکلیں باقی ہیں لیکن اصلی روح باقی نہیں رہی اور ان کی شکلیں بغیر روح کے ایسی ہی ہیں جیسے جسم بغیر جان کے یا نیام بغیر تلوار کے۔ لیکن اس کے باوجود ایک اہم نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ ہر چند ہمارے ان اجتماعوں میں آج وہ روح باقی نہیں رہی لیکن ان کی پابندی اور قیام نہایت ضروری ہے۔ اسلئے کہ ہماری فلاح اور سعادت جب بھی آئے گی انہی شعائر کی راہ سے آئے گی۔ آپ تاریخ انسانیت کے بہترین زمانہ یعنی عہد رسالتمآب صلی

اللہ علیہ وسلم پر نگاہ ڈالئے۔ نظر آجائے گا کہ فلاح اور سعادت کے چشمے انہی چٹانوں سے پھوٹے تھے اسلئے ہمارے لئے، مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ خدا کی زندہ کتاب ہمارے پاس ہے اسی میں اس کے رسولؐ کا اسوۂ مقدسہ روشنی کے بلند مینار کی طرح ہماری راہ نمائی کے لئے موجود ہے۔ اس کی برگزیدہ جماعتوں کے کارنامے، مردہ دلوں میں نئے ولولے پیدا کرنے کے لئے ہمارے سامنے ہیں۔ بس اتنی ضرورت ہے کہ ہم ہر طرف سے کٹ کر اپنے آپ کو پھر سے اسی نظام سے وابستہ کرلیں تو انہی چٹانوں سے ہمارے لئے زندگی کے چشمے اسی گرمجوشی سے اُبلنے لگ جائیں گے۔ اور ان کی سیرابی سے ہماری ملت کے گلستان میں پھر سے بہار آنے لگے گی۔

نہیں اقبال نومید اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

میری طرف سے آپ احباب کو مبارک ہو وہ عید جو ہمارے سامنے اسلامی زندگی کے جمال و جلال کی جھلک پیش کرکے اس بھولے ہوئے عہد و پیمان کی یاد تازہ کردیتی ہے کہ

اللہ اکبر ۔ اللہ اکبر ۔ لا الٰہ الا اللہ ۔ واللہ اکبر ۔ اللہ اکبر و للہ الحمد

ہر قسم کی بڑائی اللہ کے لئے ہے۔ اس کے سوا کوئی اور ایسا نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔
کبریائی اور ستائش کی سزاوار اسی کی ذات ہے۔

(پرویز)

(تیسری تقریر از علامہ اسلم)

(۳) **عید کا پیغام** آج عید ہے۔ یہ دن اس لحاظ سے سال بھر میں مسلمانوں کا سب سے بڑا خوشی کا دن ہے کہ ایک مہینہ روزہ رکھنے کے بعد نصیب ہوتا ہے۔

دن نکلتے ہی نہا دھو کر اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر اللہ کا نام لیتے ہوئے، اس کی حمد اور تکبیر کرتے ہوئے اور اللہ اکبر ۔ اللہ اکبر ۔ لا الٰہ الا اللہ ۔ واللہ اکبر ۔ اللہ اکبر ۔ و للہ الحمد پڑھتے ہوئے عید گاہوں میں آکر جمع ہوتے ہیں۔ جہاں سب کے سب ایک امام کے پیچھے صف بستہ ہوکر عید کا دوگانہ ادا کرتے ہیں اور اپنے مالک کے حضور میں عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ اس مبارک مہینے کے دنوں کے روزوں اور راتوں کی عبادتوں اور ریاضتوں کی قبولیت اور اپنی مغفرت کی دعائیں مانگتے ہیں اور خدا کی عظمت و جلال کے آگے خوف اور امید سے گڑگڑا کر اپنے دلوں کا خون آنکھوں کی راہ سے بہاتے ہیں۔

کتنا سنجیدہ تیوہار ہے اور کس قدر متین! سب کی زبانوں پر اللہ کا نام ہے اور دلوں میں اسی کا خیال۔ نہ شور ہے نہ شر، نہ شورش ہے نہ جوش، نہ کھیل ہے نہ کود، نہ نقل ہے نہ سوانگ۔ بس ایک رضائے الٰہی سب کے پیش نظر ہے اور سب اسی کے آگے سجدہ کرنے اور اپنی دلی آرزوئیں پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

بے شک عید خوشی کا دن ہے۔ کیونکہ مسلمان اپنے اکیلے رب کا بندہ ہے اس کی خوشی یہی ہے کہ اپنے رب کو اس کے احکام کی فرمانبرداری سے راضی کرے اور عید کے دن وہ اُمید رکھتا ہے کہ رمضان المبارک کی عبادتوں کی بدولت آج اسکی دعائیں قبول ہوں گی اس کے گناہ بخشے جائیں گے اور اس کے قصور معاف ہونگے، سچے بندوں کی خوشی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے مالک کو راضی کریں۔

اس خوشی کے دن ہر محلے کے خوشحال مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ عیدگاہ جانے سے پہلے اپنے پڑوس کے غریب اور محتاج بھائیوں کو عید کا صدقہ پہنچا دیں تاکہ وہ سوال سے بے نیاز ہو کر سب مسلمانوں کے ساتھ عید میں شریک ہو سکیں۔ آج کے دن ہر مسلمان نہا کر اپنے بہتر سے بہتر لباس پہن کر اور خوشبو لگا کر عیدگاہ میں آتا ہے اور تمام دنیائے اسلام میں یہ اجتماع ہر جگہ اسی طرح ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے عید کا مجمع نہ صرف مسلمانوں کی شائستگی اور خدا پرستی بلکہ ان کے اجتماعی جمال و جلال کا بھی مظہر ہے۔

عید کی نماز کے بعد مسلمان آپس میں گلے ملتے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ اس خوشی کے دن دلوں سے کینہ اور دشمنی کو نکال دیں۔ اور بھائی سے بھائی گلے مل کر محبت کے عہد کو نئے سرے سے تازہ کریں۔ بعض بعض تو اس موقعہ کے اس قدر شائق ہوتے ہیں کہ اس متین مجمع کے وقار کے خلاف اس میں ہلچل اور بے ترتیبی ڈال دیتے ہیں۔ لیکن یہ رسم خود ہماری پیدا کی ہوئی ہے ورنہ ہمارے باہمی اتحاد اور محبت کی بنیاد اس سے بہت بلند ہے۔ وہ ایک اکیلے معبود کی رضا طلبی پر ہے جس کے آستانہ پر پوری ملت کی آرزوئیں اور دعائیں جھکتی ہیں اور گلے ملتی ہیں۔ اسی وحدتِ مقصد میں اتحادِ ملت کا راز مضمر ہے۔

آج مسلمانوں پر عام طور پر غربت اور بیکسی مسلط ہے اور اس وجہ سے ہماری عید غریبوں کی اور بیکسوں کی عید ہے لیکن اسلامی ملکوں میں اب بھی اس کی شان و شوکت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔

یہاں اہل نظر کے لئے سوچنے کا مقام ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے بزرگوں کو حکومت، عزت، مال، جاہ اور ہر قسم کی نعمتیں بخشی تھیں، اور اب کیا بات ہو گئی کہ ہم سے ایک ایک کر کے ان کو چھینا جا رہا ہے۔ ہماری ملت کے اکثر افراد جس زوال کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں وہ اسقدر ہولناک اور جانگداز ہے کہ ہماری خوشی کا دن بھی جو آتا ہے وہ اس غم کو مٹا نہیں سکتا۔

آج اگر کوئی شخص ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑا ہو کر دنیا کی قوموں کا نظارہ کرے تو اس کو سب سے زیادہ تعجب مسلمانوں پر ہو گا جو صدیوں تک بے نظیر عروج حاصل کرنے کے بعد جس کے ذکر سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں، اب عام طور پر تنزل میں پڑے ہوئے ہیں اور دوسری قومیں دن رات عروج اور ترقی حاصل کر رہی ہیں۔ اس لئے یہ ایسا امر ہے جس کے اوپر مفکرین اسلام کو زیادہ سے زیادہ غور کرنا چاہیئے تاکہ وہ مسلمانوں کی پستی کے اسباب کے ازالہ کی کوشش کر سکیں میرے نزدیک، ہماری پستی کے بڑے سبب دو ہیں:-

(۱) پہلا یہ ہے کہ اس امت کی سربلندی اور اس کا عروج سب قرآن کریم کی پیروی کی بدولت ہوا تھا لیکن رفتہ رفتہ امتِ اسلامیہ اس کتابِ الٰہی کی تعلیمیں سے جو ہمارے لئے دینی اور دنیاوی اور اجتماعی اور انفرادی ہر قسم کی تعلیمات اور حقیقی تعلیمات کا مجموعہ ہے دور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اب یہ دوری اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ یہ کہتے ہوئے میری گردن ندامت سے جھک جاتی ہے کہ جو کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا دستورالعمل تھی آج تمام امتِ اسلام میں جو مراکو سے چین تک پھیلی ہوئی ہے کوئی قوم یا جماعت ایسی نہیں ہے جس نے اسکو عملاً اپنی زندگی کا قانون بنایا ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا یہ دینی اور ذہنی مرکز جو ہماری ہدایت کا سرچشمہ ہے متروک ہو گیا۔ اور اسکے قوانین اور ضوابط خاص کر اجتماعی نظام خود مسلمانوں میں رائج نہیں رہے۔ اور اسکے

اوپر ہمارا ایمان محض اعتقادی اور زبانی رہ گیا۔ اسی وجہ سے امت سینکڑوں فرقوں میں منقسم ہو گئی۔ اسلئے مسلمانوں کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ اس کتابِ الٰہی اور نورِ مبین کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں تاکہ اس کی روشنی میں باہمی فرقہ بندیاں اور مذہبی جھگڑے مٹ جائیں اور سب کے سب آپس میں بھائی بھائی ہو کر متحد ہو جائیں۔

(۲) دوسرا سبب اور نہایت اہم سبب ہماری "لامرکزیت" یعنی مرکز کا نہ ہونا ہے۔ اور امت اسلامیہ اپنا مرکز کھو دینے سے پستی میں جاگری ہے۔

آج تمام عالمِ اسلام ایک بے سری جماعت ہے جس کا نہ کوئی مرکز ہے نہ کوئی نظام ہے ہم کو خدا نے صرف اپنا غلام بنایا تھا اور اس امیر کی، جو قرآنی احکام نافذ کرے، اطاعت کا حکم دیا تھا۔ جب تک امت اسکے اوپر عمل کرتی رہی برسرِ عروج رہی، لیکن بہت تھوڑے عرصے کے بعد خود ہمارے ہی ہاتھوں یہ مرکز ٹوٹ گیا، جس کی وجہ سے مختلف حکومتوں سلطنتوں اور بادشاہتوں میں ملت تقسیم ہو گئی۔ اور ایک کو دوسرے سے سوائے اسلامی اشتراک کے اور کوئی تعلق نہیں رہ گیا۔

مرکز کے فنا ہو جانے سے ملت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا اور کوئی اجتماعی قیادت اور راہنمائی نہیں رہی جس کی وجہ سے عمل کی صلاحیت گم ہو گئی اور زوال آگیا اس لئے اگر ہم چاہتے ہیں کہ پھر دوبارہ ملتِ اسلام متحد ہو کر ایک مرکز پر آجائے تو ہم کو ایسے امیر کی اطاعت اختیار کرنی چاہیئے جو قرآن کے مطابق چلائے اور ہر حصہ کے مسلمان ایک مرکز پر آجائیں تاکہ رفتہ رفتہ پوری ملت متحد ہو سکے۔ ورنہ ڈر ہے کہ انفرادیت اور لامرکزیت ہلاکت تک پہنچا کر نہ چھوڑے۔

یہ دونوں باتیں جو میں نے عرض کی ہیں قیاسی نہیں ہیں بلکہ ہمارے دینی فرائض ہیں۔ قرآن کریم پر ہر مسلمان کا ایمان ہے اور وہ یقین رکھتا ہے کہ اس پر عمل کرنا نجات ہے۔ اسی طرح اطاعتِ امیر جس کے احکام قرآن میں کھلے کھلے اور واضح طور پر دیئے گئے ہیں۔ ہر مسلم پر فرض ہے کہ ان دونوں یعنی قرآن اور امیر سے ملت عملی طور پر متحد ہو سکتی ہے۔

علاوہ بریں وحدتِ ملت کے اور بھی اسباب ہمارے اندر موجود ہیں۔ تمام دنیائے اسلام میں یکساں ہر جگہ پانچوں وقت اذانیں پکاری جاتی ہیں اور نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ تمام دنیائے اسلام سے ہر قوم اور ہر ملک کے نمائندے دریا، کوہ اور بیابان قطع کرتے ہوئے حج کے موسم میں مکہ میں آتے ہیں اور شاہ و گدا کا امتیاز اٹھا کر ایک لباس میں میدانِ عرفات میں جمع ہو جاتے ہیں۔ آج کی عید بھی تمام دنیائے اسلام میں یکساں اور ایک ہی انداز سے منائی جاتی ہے۔ اس لئے ہمارے اتحاد میں کوئی دشواری نہیں ہے اور امت اسلامیہ کیلئے اللہ اور رسول کی ہدایت اور تعلیم کی روشنی میں فلاح و نجات کی راہ میں قدم رکھنا اور دینی و اعتقادی مرکز قرآن کریم کو بنانا اور عملی مرکز اطاعتِ امیر کو اختیار کرنا عین اس کے ایمان کے مطابق ہے۔

میں اپنے تمام بھائیوں بہنوں کو عید کی مبارکباد دیتا ہوں اور خلوص دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ہم سب کو ایک دل اور ایک زبان کر دے اور اپنی رحمت سے ہمارے قصوروں کو معاف کر کے ہم کو صحیح راستہ پر چلائے۔

(اسلم جیراجپوری)

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دکان

سٹینڈرڈ آٹوموبائلز پر تشریف لائیے

سپیشلسٹ، ڈاج۔ بیڈفورڈ۔ لی لینڈ۔ بی۔ ایل۔ ایم سی۔ ڈیلرز، موٹر پارٹس۔ ٹرک (ڈیزل) پارٹس

۱۳۵ بادامی باغ ـــ ٹیلیفون ۶۹۰۱۲ لاہور

ضروری نوٹ

قارئینِ طلوع اسلام نوٹ فرمالیں کہ ادارہ طلوع اسلام سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ بصورت دیگر خط و کتابت کا جواب نہیں دیا جائیگا۔

(ناظم)

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

O ye who believe! Fear God as He should be feared and die not except in a state of Islam. And hold fast all together, by the Rope which God stretches out for you and be not divided among yourselves

PREMIER TOBACCO
INDUSTRIES LIMITED